12

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دکن کے مشاہیر کے مضامین
قدیم اخبارات و رسائل سے فراہم
کر کے ان مضامین کو پہلی بار
کتابی صورت دی گئی

زیر نظر کتاب میں ۱۴ مضامین
کے علاوہ ۵۳ اخبارات کے تعزیتی
اداریے ، آخر میں دو پیامات
تعزیت شریک ہیں ۔

بہادر یار جنگ

مشاہیر دکن کی نظر میں

مرتبہ:- نذیر الدین احمد

سلسلہ مطبوعات بہادر یار جنگ نمبر ۱۲

بہادر یار جنگ

مشاہیرِ دکن کی نظر میں

(مرتبہ)

نذیر الدین احمد عثمانیہ
سابق میونسپل کونسلر

بہ اہتمام

نواب نصیب خاں صاحب
(فرزند آغوشی حضرت قائد ملت ؒ)

ناشر:- قائد ملت اکیڈیمی۔ چیلہ پورہ۔ حیدر آباد

طبع اول	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	مئی ۱۹۷۹ء
قیمت	دو روپے
کتابت	محمد مظہر
طباعت	اعجاز پرنٹنگ پریس
سرورق ڈیزائن	ایم۔ اے غفار آرٹسٹ
طباعت سرورق	انتخاب پریس
مسودات ٹائپ	عبدالقادر ٹائپسٹ
بہ اہتمام	نواب نصیب خاں

ملنے کے پتے

سوپر سانک کاپینگ سنٹر۔ دیوان دیوڑھی حیدرآباد

انجمن جہد و بیر جنچل گوڑہ۔ حیدرآباد

حیدرا بینڈ سنس۔ مچھلی کمان حیدرآباد

حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان حیدرآباد

انتساب

میں اس کاوش کو حضرت قائد ملت رح کے شیدائی اور اپنے دور کے عظیم قائد مولوی قادر علی خاں صاحب امان زئی کے نام معنون کرتا ہوں۔

جن کی شعلہ بیان تقریریں آج بھی ملت کے خدمت گذاروں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ جن کی پوری جوانی ملت کی خدمت گذاری میں صرف ہوئی جو سراپا مجسم خلوص و مجسم ایثار ہیں۔ سب کچھ ملت کی نذر کر کے وہ انقلاب زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہوکر بے وطن ہوا۔

الحمدللہ مجھے اس عظیم انسان کے فیضان صحبت سے مستفید ہونے کی عزت حاصل رہی اور یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے پہلی بار عوامی زندگی سے روشناس کروایا۔ اور عوامی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔

آج وہ مجھ سے ہزاروں میل دور ہیں۔ لیکن ان کا بے انتہا خلوص اور ان کا دیا ہوا درس حرز جاں ہے۔ خدا انہیں اپنی سلامتی میں رکھے۔ آمین۔

نذیرالدین احمد

ابتدائیہ

ابتداً فروری ۱۹۶۸ء میں قائدِ ملت کے نقوشِ قلم کی اشاعت کے تحت جو سلسلہ "نگارشاتِ بہادر یار جنگ" سے شروع ہوا۔ اس سلسلے کی دس کتابیں شائع ہوئیں، آخری کتاب "بہادر یار جنگ کی ڈائری" تھی جو مارچ ۱۹۷۱ء میں چھپی۔

حوصلہ شکن حالات کا تقاضہ تھا کہ ع

کرو چراغ گل کہ اب روشنی کیوں ہو

دسمبر ۱۹۷۸ء میں مولوی وحید الدین خاں صاحب یوزفی معتمد بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی، تحفۂ برگ گل و بادِ بہاراں لے کر تشریف لائے۔ سب شیدائی یکجا ہوئے اور ایک دوسرے سے ملے ع

ملے تو بچھڑے ہوئے میکدے کے در پہ ملے

پھر یہ قافلۂ عشق بیابانوں سے نکلا ؎

تحفۂ برگ گل و بادِ بہاراں لے کر

قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

مولوی عبدالرحمن سعید نے حیاتِ بہادر یار جنگ پر قلم اٹھالیا، اربابِ انجمن حیدرویہ جنچل گوڑہ نے حسبِ اعلان ۱۹۷۹ء میں بہادر یار جنگ ہال کا سنگِ بنیاد

رکھ دیا، میں نے سب سے اپنا کام شروع کر دیا، اپریل ۱۹۷۹ء میں قائد ملت
اکیڈیمی کے سلسلۂ اشاعت کی گیارھویں کتاب "بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں"
چھپ چکی اور اب ۱۹۷۹ء میں زیر نظر کتاب "بہادر یار جنگ مشاہیر دکن کی نظر میں"
حاضر خدمت ہے۔ اس طرح ۱۹۷۹ء میں مزید چار کتابیں شائع ہوں گی۔

زیرِ نظر کتاب میں گلشنِ دکن کے ہی پھول ہیں جنھوں نے قائد ملت کی خدمت میں
پُر خلوص نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان میں اکثر ایسے ہیں جن کا وطن ان سے ضرور
چھوٹا مگر رشتۂ وطن نسبت پیمانہ باقی رہا اور اکثر مضمون نگاروں کا رشتۂ حیات
بھی منقطع ہو چکا، اللہ انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

یقیناً یہ مسلمانوں کی بدبختی ہے کہ ان کے اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت قائد
کی تصانیف پراگندہ کاغذات میں بکھری پڑی ہیں، مسلم قوم کی اپنے اسلاف سے غفلت
اور سرد مہری کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن یہ بڑی بدبختی ہے ؎

زمانے کے قدموں نے ان ہی کو روندا
چلا جن کے نقشِ قدم پر زمانہ

انشاء اللہ اب بغیر کسی رکاوٹ کے حضرت قائد ملت پر لکھے گئے مضامین
نواب صاحب کی تقاریر و نگارشات کا ایک ایک لفظ چھپے گا۔

ہمارے اس عظیم کام میں جناب سردار علی خاں صاحب سابق رکن بلدیہ
ہمارے شریک و سہیم ہیں اور اپنا قومی فرض پورا کر رہے ہیں۔

جناب نصیب خاں صاحب فرزند آغوشی حضرت قائد ملت نے پورے
خلوص اور نہایت عقیدت مندی سے اس کام میں پورے تعاون کا یقین دلایا
ہے۔ مخفی بہادر حضرت قائد ملت کے افراد خاندان میں یہ واحد فرد ہے جس نے

ابتداء سے آج تک ہمارے اس عظیم قومی کام میں ہر طرح کی مدد کی اور پوری پوری دلچسپی لی۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔

مجھے پوری امید ہے کہ اس بار حضرت قائد ملت کے عقیدت مندوں کا پورا پورا تعاون حاصل رہے گا۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے قائد ملت کے ایک ایک ورق کی اشاعت کو میرے نصیب کا سودا بنایا اور یہ سودائے جبہ سائی میرے سر ہوا ہے

سودائے جبہ سائی میرے سر ہوا تو کیا
اس پائے کا نظر میں کوئی آستاں نہیں

وما علینا البلاغ

مئی ۱۹۷۹ء

نذیر الدین احمد

۲۳-۶-۷۲ جبیلہ پورہ، حیدرآباد
آندھرا پردیش (انڈیا)

نظر حیدرآبادی

بہادر یار جنگ

میرے ہم وطن چاہے مجھ سے ناخوش ہوں یا خوش، لیکن اس حقیقت کے اظہار میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ حیدرآباد میں بہادر یار جنگ کا وجود ایسا ہی تھا جیسے کسی ریگستان کے دور دراز گوشہ میں ایک ہرا بھرا نخلستان، نوابوں اور جاگیرداروں کی چنگ و رباب سے گونجتی ہوئی محفلوں میں صداقت کی پہلی آواز، تہذیبی ملمع کاری کی مسلسل رات میں حقیقت کی اولین کرن، شاہ پرستی کی راکھ میں حق شناسی کی تنہا چنگاری! ہم اپنے کنوئیں کی چار دیواری میں مست خواب تھے۔ اس نے ہواؤں کی سرگوشیاں سنیں اور نبض دریا پر ہاتھ رکھا اور آمد طوفان کی سب سے پہلے خبر دی لیکن ہم نے اس کی خبر گیری کا کیا صلا دیا۔ جو بنی اسرائیل نے موسیٰ کو دیا تھا۔ اور شاید اسی لیے بحیثیت کے اس لق و دق صحرا میں ہمیں مسلسل آزمائشوں کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ جواں مرگ بہادر یار جنگ کی زندگی کے کئی رخ ہیں اور اس کا ہر رخ اس قابل ہے کہ اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ ہماری زندگی کی تاریک اور غیر متعین راہوں میں اس کے مطالعہ سے اجالا پھیل سکتا ہے۔ بہادر یار جنگ حیدرآباد کے معزز جاگیردار نواب نصیب یاور جنگ (ثالث) کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کو راکٹ پلی اور لال گڑھی کی جاگیر کے علاوہ نواب نامی، بہادری

عماری اور نوبت کاری اور ایک ہزار سوار اور دو ہزار روپیہ ماہانہ کا منصب بھی حاصل تھا۔ بہادر یار جنگ اگرچہ نصیب یاور جنگ کے بڑے فرزند تھے لیکن بہت کم عمری میں چونکہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اس لیے نہ صرف شفقت مادری سے محروم کر دیے گئے بلکہ سوتیلی ماں کی عنایتوں کی وجہ سے التفات پدری سے بھی ایک گونہ ناآشنا رہے اور اس طرح ان کی ابتدائی تربیت ننھیال میں ہوئی۔ خوش قسمتی سے نانی بڑی صاحب دل خاتون تھیں۔ ان کی آغوش محبت نے ہر محرومی کی تلافی کر دی اگرچہ تلافی میں جاگیردارانہ ماحول کے روایتی لاڈ اور چونچلوں کا بہت کم دخل تھا۔ جس وقت بہادر یار جنگ کے ہم عمر اور ہم رتبہ بچے بٹیریں لڑاتے یا کبوتر اڑایا کرتے وہ مکتب کا درس یاد کرنے میں مشغول رہتے یا تلاوت قرآن پاک میں مصروف۔ ان کی نانی اتنی معاملہ فہم تھیں کہ انھوں نے بہادر یار جنگ کی تعلیم کے لیے جاگیردار کالج یا امراء کے مدرسۂ عالیہ کی بجائے درمیانہ درجہ کے طالب علموں کے مشہور مدرسۂ دارالعلوم کا انتخاب کیا۔ یہی وہ دانشمندانہ فیصلہ تھا جس نے بہادر یار جنگ کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ وہ بٹیریں لڑانے والے نوابوں کی بجائے شاہین فضا پیما بن گئے۔

بچپن گزرا نوجوانی، یتیمی کا داغ اور ورثہ میں شاہ خرچ باپ کا ہزاروں روپے کا قرض لے کر آئی اور اس طرح قدرت نے انھیں ابتدائے زندگی میں ہی تنظیم و تعمیر کی تربیت کا وہ موقع فراہم کر دیا جس سے آگے چل کر انھوں نے اپنی ملت کی تنظیم و تعمیر میں پورا فائدہ اٹھایا اور جب ذرا سکون میسر آیا اور دنیوی کثافتوں سے نجات پائی تو عالم اسلام کی سیاحت بھی کی

اور حج بیت اللہ اور روضۂ نبوی کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے اور اس سیاحت کا حاصل ہندوستان واپس آ کر اس طرح پیش کیا کہ خواجہ حسن نظامی کو لکھنا پڑا کہ موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمانوں نے اسلامی ممالک کی سیر کی اور سفر نامے لکھے جن میں ایک میں بھی ہوں اور مرحوم مولانا شبلی بھی ہیں اور محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار بھی ہیں اور بھوپال کے ایک مسلمان بھی ہیں جنھوں نے اسپین کا بہت اچھا سفر نامہ لکھا ہے اور مرحوم حافظ عبد الرحمن امرتسری بھی ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے ایک ہی وقت میں تمام اسلامی دنیا کے ملکوں اور قوموں کو دیکھا ہو، اور مذہبی اور سیاسی اور معاشرتی مقاصد کو سامنے رکھ کر دیکھا ہو۔

اس لحاظ سے نواب بہادر یار جنگ ..... سب سیاحوں سے اعلیٰ ہیں۔ (قائد ملت صفحہ ۲۹)۔ اس سیاحت کے بعد تن آسانی سے اتنی سرگرانی بڑھی کہ گاؤں گاؤں کی خاک چھانی اور پچیس ۲۵ ہزار نفوس کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ان کی ملنساری، رواداری اور خوش خلقی ایک مثالی درجہ رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بذلہ سنج اور خوش طبع بھی بلا کے تھے خوش خوراک اور کھلانے پلانے کے بڑے شوقین تھے خصوصاً آموں کے بڑے رسیا تھے ان کی آم پارٹیوں کی یاد سے دل اب بھی مسوس کر رہ جاتا ہے اور میر عالم کے تالاب کے وہ مناظر سینما کی متحرک تصویروں کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ جب سورج کی پہلی کرن کے ساتھ بہادر یار جنگ کا شوق پیراکی تالاب کے پُرسکون ماحول میں ہلچل پیدا کر دیا کرتا

تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے دکن کی صدیوں کی پُرسکون گورستان میں ان کی صدائے تم نے ہل چل پیدا کردی تھی! ــــ ہاں تو نواب صاحب نہار رہے ہیں۔ اور وہ ساحل نشین بھی جنھیں تیرنا نہیں آتا وہ بھی ان کے ساتھ یکساں کھانے کا لطف اٹھا رہے ہیں ایک دوسرے پر آموں کی بوچھار ہو رہی ہے اور وہ ساحل نشین بھی جنھیں تیرنا نہیں آتا اور جو اس کشمکش میں شریک ہیں وہ بھی اس رنگ رس کی بوچھار سے نہ محفوظ ہیں نہ محروم۔ تالاب کے دائرے سے نکلے تو دستر خوان چنا گیا اور شرکار کا حلقہ بنا۔ لیکن یہاں شہ حیدرآبادی تکلفات ہیں نہ تسلیم و آداب کی پریڈ، چھینا جھپٹی کا سا عالم ہے جس کے ہاتھ جو لگا کھا رہا ہے اور دھوم مچا رہا ہے۔ کھانا ختم ہوا تو پھر آم خوری شروع ہوئی اور جب ڈکارنے کے بھی قابل نہ رہے تو یہ جنگ دست و شکم ختم ہوئی۔ اور یار لوگ صفیں سیدھی کر کے بیٹھ گئے اور ڈرامہ کا آخری سین شروع ہوا، اور پروگرام کا یہ حصہ بہت دلچسپ ہوتا تھا اس موقع پر یہ لازمی تھا کہ ہر شخص کم از کم ایک شعر گا کر سنائے ہم سے گلوکار تو اس امتحان میں ہنستے کھیلتے کامیاب ہو جاتے لیکن لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا جب علمائے کرام کی باری آتی۔ وعظ و پند کے دریا بہانے والے ہونٹوں کی لرزشیں اور جبہ و دستار سے سجے ہوئے جسموں کی کپکپی قابل دید ہوتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب کہ "ایک عالم" کو لہجہ مجبور کیا گیا تو وہ زار و قطار رونے لگے۔

شعر و ادب سے بھی قلبی ربط تھا۔ قلق تخلص کرتے تھے۔ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے شعر گوئی کا موقع کم ملتا تھا۔ اکثر سفر میں گزرتی تھی لیکن کبھی سفر کو سفر نہ بننے دیا۔ جب اِدھر اُدھر کی باتوں سے تھک جاتے تو طبیعت خود بخود شعر گوئی

کی طرف مائل ہو جاتی۔ شعر دوسروں کو لکھوا دیا کرتے۔ اکثر مواقع پر مجلس اتحاد المسلمین کے معتمد جناب یامین زبیری نے ان کے شعر قلم بند کیے ہیں بعض اوقات راقم الحروف کو بھی یہ شرف حاصل ہوا ہے۔ شاعری ان کا فن نہیں تھا۔ لیکن شعر فہمی سخن سنجی اور نکتہ رسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے انتقال کے کئی برس بعد ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی نے اپنے نئے مجموعۂ کلام "آتش گل" کو ان کے نام سے معنون کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں اپنے اس مجموعہ کلام کو قائد ملت مولوی بہادر خاں مرحوم (سابق بہادر یار جنگ) کے نام نامی سے منسوب کرنا اپنا اخلاقی و ادبی فرض تصور کرتا ہوں جو سراپا مجسم اخلاص فقید المثال مقرر، کامیاب مصلح، اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب اور جری انسان تھے جن کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہ تھا، وہ بیک وقت تمام محاسن شعری کا احاطہ کر لیتے تھے اور اچھے شعر سے اسی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی دوسرا خوش مذاق نہیں دیکھا۔

اسی فہم رسا اور ذوق سلیم نے انھیں پہلے پہلے اقبال کا مرتبہ دان بنایا اور آخر آخر میں عارف ہندی ان کے مرشد معنوی بن گئے۔ اس میں ان کا ایک فقرہ بہت مشہور ہے۔

کسی کا مہدی کوئی اور ہو تو ہو میرا مہدی تو اقبال ہے۔ یہ فقرہ اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ بہادر یار جنگ فرقہ مہدویہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سچ ہے، ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش فکر۔ کلام اقبال سے ان

قائداعظم سے ان کا پہلا تعارف مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر بمقام شولاپور میں ہوا تھا۔ قائداعظم نے خطبہ صدارت انگریزی میں دیا تھا۔ جسے حاضرین کی اکثریت سمجھنے سے قاصر تھی۔ ضرورت تھی کہ اس کا اردو ترجمہ سنایا جائے نظرِ انتخاب بہادر یار جنگ پر پڑی۔ نواب صاحب نے ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر خطبہ صدارت کا اتنا فصیح و بلیغ انداز میں ترجمہ سنا دیا کہ محفل جھوم گئی اور اس طرح مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو ایک زبردست خطیب اور مفکر قائد کو ایک معجز بیان زبان مل گئی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے جلسے اور بہادر یار جنگ کی تقریریں دو لازم و ملزوم چیزیں ہو گئیں۔ قائداعظم کو بہادر یار جنگ کے کردار اور گفتار پر اتنا اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ نازک سے نازک مرحلہ پر ان کے مشورے کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ لاہور کا وہ تاریخی اجلاس مسلم لیگ جس میں قرارداد پاکستان پیش کی گئی سر سکندر حیات خاں کی حکومت کے حسن انتظام کی وجہ سے ملتوی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ خاکساروں پر چلائی ہوئی گولیوں نے باشندگان لاہور کے محسوسات کو بھی چھلنی کر دیا تھا۔ فضا بہت مکدر ہو چکی تھی خود سر سکندر نے ٹیلیفون پر قائداعظم کو صورت حال بتادی تھی، اور اجلاس کے التواء کی التجا کی تھی۔ دہلی میں مسلم لیگی زعماء عجیب شش و پنج میں گرفتار تھے۔ اس گومگو کے عالم میں صرف بہادر یار جنگ کی ذات تھی۔ جس نے قائداعظم سے اپنی ذمہ داری پر جلسہ ملتوی نہ کرنے کی درخواست منظور کروائی۔ جلسہ ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا، اور قرارداد پاکستان اسلامیان ہند کی منزل قرار پائی ہزاروں شاہدین اس کی گواہی دیں گے کہ اس کی کامیابی میں بہادر یار جنگ کی شعلہ نوائی کو کتنا دخل حاصل رہا ہے۔ تحریک پاکستان

کو اتنا شغف تھا کہ اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں انھوں نے اپنے گھر بیت الامت میں ایک حلقہ درس اقبال قائم کیا تھا جہاں ہفتہ میں ایک بار حیدر آباد کے اہل علم جمع ہو جاتے اور کلام اقبال کی توضیح و تشریح کی جاتی۔ مذکور باتیں بہادر یار جنگ کی زندگی کی چند جھلکیاں ہیں۔ ان کی شخصیت اس وقت بلند ہوتی ہے جب وہ ایک آتش بیان خطیب اور صاحب علم و مدبر سیاست داں کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ فن تقریر بھی ایک وہبی فن ہے۔ اکتساب سے اس کا حصول ناممکن ہے۔ اکتسابی لوگ زیادہ سے زیادہ واعظ بن سکتے ہیں لیکن لسان الامت کہلانا ایک مقبول بارگاہِ الٰہی ہی کا حصہ ہے۔ بہادر یار جنگ نے جب سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو وہ لسان الامت کی حیثیت سے روشناس خلق ہو چکے تھے پھر دیکھتے دیکھتے اصابت رائے بے داغ کردار، خلوص کار اور گل افشانی گفتار کی وجہ سے قائد اعظم کے منظورِ نظر اور اسلامیانِ ہند کی تمناؤں کے ترجمان اور امیدوں کے مرکز بن گئے۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کو اعتراف کرنا پڑا کہ:

ہندوستان نے اگر دوسرا محمد علی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا۔ وہی اخلاص وہی دینی جوش وہی تڑپ اور وہی سوجھ بوجھ وہی ہمت و عزم بالخیر محمد علی کی انگریزی انشاء پردازی کے سوا سب کچھ وہی۔ اور قائد اعظم نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں ارشاد فرمایا تھا کہ:

اعلیٰ حضرت حضور نظام کی رعایا کی حیثیت سے اگرچہ نواب بہادر یار جنگ کا کوئی دستوری تعلق مسلم لیگ سے نہیں ہے لیکن بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لیے معین اور رہبر ثابت ہوتے ہیں۔

قائداعظم سے ان کا پہلا تعارف مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر بمقام شولاپور میں ہوا تھا۔ قائداعظم نے خطبۂ صدارت انگریزی میں دیا تھا۔ جسے حاضرین کی اکثریت سمجھنے سے قاصر تھی۔ ضرورت تھی کہ اس کا اردو ترجمہ سنایا جائے۔ بنظر انتخاب بہادر یار جنگ پر پڑی۔ نواب صاحب نے ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر خطبۂ صدارت کا اتنا فصیح و بلیغ انداز میں ترجمہ سنا دیا کہ محفل جھوم گئی اور اس طرح مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو ایک زبردست خطیب اور مفکر قائد کو ایک معجز بیان زبان مل گئی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے جلسے اور بہادر یار جنگ کی تقریریں لازم و ملزوم چیزیں ہو گئیں۔ قائداعظم کو بہادر یار جنگ کے کردار اور گفتار پر اتنا اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ نازک سے نازک مرحلہ پر ان کے مشورے کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ لاہور کا وہ تاریخی اجلاس مسلم لیگ جس میں قرارداد پاکستان پیش کی گئی سر سکندر حیات خاں کی حکومت کے حسن انتظام کی وجہ سے ملتوی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ خاکساروں پر چلائی ہوئی گولیوں نے باشندگان لاہور کے محسوسات کو بھی چھلنی کر دیا تھا۔ فضا بہت مکدر ہو چکی تھی خود سر سکندر نے ٹیلیفون پر قائداعظم کو صورت حال بتا دی تھی اور اجلاس کے التوا کی التجا کی تھی۔ دہلی میں مسلم لیگی زعماء عجیب شش و پنج میں گرفتار تھے۔ اس گومگو کے عالم میں صرف بہادر یار جنگ کی ذات تھی۔ جس نے قائداعظم سے اپنی ذمہ داری پر جلسہ ملتوی نہ کرنے کی درخواست منظور کروائی۔ جلسہ ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا، اور قرارداد پاکستان اسلامیان ہند کی منزل قرار پائی ہزاروں شاہدین اس کی گواہی دیں گے کہ اس کی کامیابی میں بہادر یار جنگ کی شعلہ نوائی کو کتنا دخل حاصل رہا ہے۔ تحریک پاکستان

جانشیں المسلمین میں مقبول بنانے کے لیے قائداعظم نے ایک وفد شمالی ہند کے اضلاع کے دورے پر روانہ کیا تھا۔ اس کی قیادت کا منصب بھی انہوں نے بہادر یار جنگ کو سونپا تھا۔ بہادر یار جنگ کے پہلے ہی دورے نے صوبہ سرحد میں خان برادران کی سیاست کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے تھے اور سردار اورنگ زیب خاں مرحوم کی مسلم لیگی وزارت برسر اقتدار آگئی۔

لیکن آخر میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بلند و بالا شخصیت جو جنوبی ہندوستان کے آخری کناروں سے لے کر شمالی ہند کے آخری گوشوں تک اپنے جوش کردار اور سحر گفتار کے پرچم لہرا رہی تھی۔ جب اس دنیا سے اٹھائی جاتی تو اس نے اپنی عمر کی چالیس بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں عام لوگ یہاں سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں وہاں اس نے اپنی منزل پالی۔ ح

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

وہ فروری ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کی شب اپنے ایک قدیم دوست ہاشم علی خاں کے ہاں ڈنر کھانے گئے تھے کھانے میں دیر تھی، وقت گزاری کے لیے حقہ منگوایا اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور سکندر علی وجد سے اقبال کے اس شعر

ہر مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

کے متعلق اپنے تاثرات بیان کر رہے تھے حقہ کے پہلے ہی کش کے ساتھ ایک ہچکی آئی اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی گویا شاہین بلند پرواز کا ذوق سفر اسے ہر ایک مقام سے آگے لے کر چلا گیا!!

از:۔ پروفیسر مولوی غلام دستگیر صاحب رشید

بانگ اذاں

حق مغفرت کرے بہادر خاں مرحوم محبوب قائد ملت عجب آزاد مرد تھے۔ بہادر خاں کا نصب العین اور مشن اسلاف اسلام اور دین کے زریں عہد کی دعوت الی اللہ کی آواز باز گشت تھی ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں اسلام کی عظمت و جلالت کا گم کردہ یقین تازہ کرتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا احسان یہی تھا کہ اسلامی افکار کی ایسی تبلیغ اور خطیبانہ تعبیر کرتے تھے جس سے ہم اسلام کو انسانی خدمت اور ترقی کا ایک گراں قدر ذریعہ بنا دیں۔

قابلِ اعتماد دستگیر:۔ کئی ایسے مشاہیر ہندو قائدین نے جو ان سے شدید سیاسی اختلاف رکھتے لیکن ان میں سے کٹر سے کٹر مخالف نے بھی اپنے تعزیتی بیان میں اس احساس شدید کا اظہار کیا اختلاف رائے کی بات اور تھی لیکن ان کے بے باک ضمیر، بے مثل قیادت، مجاہدانہ عزیمت اور مخلصانہ رفاقت پر سب کو اعتماد تھا۔ مخالفین کا یہ دلی اعتماد سیرتِ علم کی سچی شان ہے۔

سراپا اسلام: ان کے ظاہر و باطن میں اسلام جاری و ساری تھا ان کی ساری زندگی سیاست، معاشیات اور معاشرت اسلام کے ان ہی رنگ میں رنگی ہوئی تھی وہ دل سے اس مقصدِ عالی کے لیے جہاد کرتے رہے

کر سچے معنوں میں ہم کو ہمارے اجتماعی اور حکومتی اداروں کو مسلمان کردیں اقبالؒ نے یہ سوال کیا۔

خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

بہادر خاں اس سوال کا جواب تھے۔

ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں

ان کی مصروف زندگی ہماری بےعملی کے خلاف ان تھک جنگ کا سرچشمہ تھی کبھی مسجد میں درسِ قرآن دیتے، کبھی اشتراکیت و اسلام پر ماہرین سے تبادلۂ خیال فرماتے ان کی تنقیحات مرتب و مدون فرماتے۔ کبھی غریب طالب علموں اور بیروزگاروں کو ذاتی امداد کے علاوہ دوسری جگہ سے مدد حاصل کرنے کے لیے ساتھ ساتھ لیے پھرتے یہ ایک حساس اور بےچین دل کی گردشِ پیہم تھی۔ کبھی برِاعظم ہند کے مختلف گوشوں میں بیداری کی اذانیں دیتے پھرتے ان کے نعرۂ تکبیر اور حسنِ تقریر سے گوشہ گوشہ گونج اٹھا۔ رمضان میں سحری سے ظہر تک دفتر میں بیٹھ کر قومی کاموں کو سرانجام فرماتے، جماعت کی آستینوں میں بت تھے لیکن وہ حکم اذاں کی تعمیل میں پورا انہماک دکھاتے ہے

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

حکمت کے عاشق مجسّم حقیقت: ایمان کا کمال حکمت شناسی اور حق طلبی ہے۔ بہادر خاں مرحوم حکمت و معرفت کے سچے طالب علم بلکہ عاشق تھے۔ خیرِ کثیر یعنی حکمت ایمانی کے سچے قدر داں، کمالِ شوق سے حکیمانہ گفتگو کو سنتے حکمت اقبالؒ کے بطور خاص دالدہ تھے۔ اپنے گھر پر

اس کے باقاعدہ ہفتہ وار مطالعہ و بحث و نظر کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس باب میں وہ حیدر آباد کا بہترین حلقہ حکمت و ادب تھا۔ حقائق اقبال کے کئی مقامات کی عملی شرح در اصل خود ان کی اپنی مجاہدانہ زندگی تھی۔ کلام اقبال کی کتنی ہی بلندیاں ان کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر سمجھ میں آجاتی تھیں۔ بقول اقبال وہ ایسے امیر تھے جس کی دلنوازی ان کی حکمت کا سرمایہ تھی اور جن کی بے نیازی ان کی اخلاقی طاقت تھی ؎

حکمت دلنوازیہائے فقر
قوت او بے نیازیہائے فقر

از:۔ مولوی عبد الرحمٰن صاحب مرحوم مدیر ’وقت‘

قائد ملّت کا تصوّر حیات

آج ہم یہاں تعزیت ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں لیکن تعزیت کس کی کیسی تعزیت وہ زندگی تو کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ حقیقت میں قومی زندگی رکھتی تھی۔ مرحوم نے اپنی ذات میں ساری قوم کو مجسم کر لیا تھا شخص کی حیثیت سے باقی نہیں رہے۔ خود ان کی ذات قوم ملّت کی مجسم تھی اس لیے آج ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ مرحوم کی موت نے ہم سب کو اپنے پسماندوں یا پیچھے رہنے والوں میں چھوڑا پھر تعزیت کس کی اور کون ادا

گرے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ صرف ہم قائد ملّت کو یاد کرنے کے لیے اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

ابھی مسٹر اکبر علی خاں نے قائد ملّت کی زندگی کو خراج ادا کیا مرحوم کی خصوصیات کو کوئی کہاں تک گنائے اسی ایک واقعہ کو لے لیجئے ہیں ان لوگوں میں تھا جو قائد ملت سے یہ کہتے رہے کہ آپ میں اور مولوی اکبر علی خاں صاحب میں مسلک کا اختلاف ہے۔ اس لیے آپ کو نہیں ملنا چاہیئے۔ مرحوم فرماتے تھے کہ اکبر علی خاں سے مسلک اور قومی معاملات میں اختلاف کا جہاں تک تعلق ہے میں بھی اتنا ہی سخت و شدید ہوں جتنے کہ تم ہو لیکن اس سے ہٹ کر وہ دوست ہیں اور میں دوست کے گھر جائے بیٹھا ہوں تو برا کیا ہے ابھی کے ساتھ جب کبھی قومی مسائل اور مسلک میں اختلاف کا موقع آتا وہ کہتے کہ وہ ہزار دوست ہی سہی لیکن میں یہاں دوستی ان سے نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی معمولی خوبی نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملّت اسلامیہ کے مفاد کی خاطر وہ ساری دنیا سے اختلاف کر سکتے تھے اور لیکن شخصی طور پر کسی کے دشمن یا کسی کے مخالف نہیں تھے۔ اس لیے سب آپ کے دوست تھے۔

قائد ملّت مرحوم کی قومی زندگی املائے کلمۃ الحق سے شروع ہوتی ہے وہ دعوت دیتے ہیں کہ آؤ توحید اور رسالت سے رشتہ جوڑ کر تم کو بلند مقام پر پہنچا دوں۔ ہزار ہا انسان اس پستی سے نکل کر قائد ملت کے ساتھ ہو جاتے ہیں ایسے میں پست کو بلند کرنے کا سوال تو ایک طرف رہا جو بلند تھے، ان کو پست کرتے اور پست مقام تک پہنچانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک طرف لارڈ لوتھیاں ریاستوں کی رعایا کی ہمدردی اور دستوری اصلاحات کا

اور دوسری طرف ایوان ہائے ریاستوں میں حکومت کے رجحان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دہلی اور شملہ کے رجحانات سے فائدہ اٹھا کر کانگریس ریاستوں میں گھسنے کی مہم شروع کردیتی ہے۔ سب سے پہلے ریاستوں میں مملکت اسلامیہ کو منتخب کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا دھاوا اسی اسلامی مرکز پر ہوتا ہے۔ سیول نافرمانی کے لیے جتھے بھیجے جاتے ہیں۔ کانگریس جہارا جا آریہ سماج یہ الگ الگ اور بعجل کر سیول آزادی کے نام سے اور کوئی دستوری اصلاح و ترقی کے نام سے صف آرا ہو جاتا ہے۔ ایک نہایت ہی نازک وقت ہے، انتشار اور پریشانی کا دور دورہ ہے خطرہ ہے کہ بادشاہ کا اقتدار رعایا پر منتقل کر کے دستوری اصلاح و ترقی کے نام سے مسلمانوں کو ان کے بلند مقام سے نکال کر غلامی کی پستی میں پہنچا دیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قیادت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ آپ نے ایک تصور حیات دیا جو آج بھی مسلمانوں کا سب سے بڑا ہتیار اور سب سے بڑی محافظت کا سامان ہے۔

آپ نے کہا کہ حیدرآباد کا اقتدار اعلیٰ حضرت آصفجاہ سابع کا اقتدار اعلیٰ ایک تاریخی واقعہ کے طور پر مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ ہے۔ تخت و تاج آصفی مسلمانوں کے تمدنی سیاسی اقتدار کا مظہر ہے۔ تم اس کو اکثریت پر منتقل کر کے مسلمانوں کو غلام نہیں بنا سکتے۔ یہ تصور حیات قائد ملت نے سرکار دو عالم کی سیرت ہی سے حاصل فرمایا تھا۔ رسالت مآب نے مدینہ کی جدوجہد میں زندگی کی ساری صعوبتیں، پیٹ پر پتھر باندھنا، بھٹی ہوئی چادر مبارک غرض ساری تکالیف و مصائب و آلام کو اپنے لیے پسند کیا۔

اور مسلمان کو فاتح مکّہ بناکر فاتح عالم بن کر الٰہی اقتدار کا آئین بنا کر چھوڑ دیا۔ دو ہی حالتیں ہیں۔ جد و جہد اور امن و اماں، جد و جہد اس وقت جب مسلمان مقتدر نہ ہوں، امن و اماں اس وقت جب وہ مقتدر رہیں۔ خدا کا اقتدار یہ مسلمان کا اقتدار یا یوں کہیے کہ مسلمان کا اقتدار جہاں کہیں مسلمان مقتدر ہے وہ امن و اماں کا پیامبر ہے، اور اس کا اقتدار خدا کے لیے اور مخلوقِ خدا کے لیے ہے۔ اس لیے یہ اقتدار آسمانی اقتدار ہے۔

غرض یہ تصورِ حیات لے کر قائدِ ملّت اٹھے اور سارے مسلمانوں کو تخت و تاج کی قوت و حفاظت کا ایک ستون بنا دیا۔ اس وقت بھی کہا گیا اور حال ہی میں ایک اخبار نے یہ کہہ کر فتنہ پیدا کرنے کی کوشش کی کہ حیدرآباد میں ہم یعنی (ہندو) ۲۲ لاکھ بادشاہوں کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ قائدِ ملّت نے ہمیشہ کہا کہ حیدرآباد میں صرف ایک ہی بادشاہ ہے۔ لیکن جب دوسروں نے اس بادشاہ کے اقتدار کو چھیننا چاہا تو قائدِ ملّت نے مسلم اقتدارِ اعلیٰ کا نظریہ عوام کو سمجھانے کے لیے اپنے طور پر بیان فرمایا جہاں دوسروں نے کہا کہ ایک کروڑ سے زیادہ بادشاہ ہیں تو قائدِ ملّت نے کہا غلط جھوٹ ہم ۲۲ لاکھ ہی اصلی لوگ ہیں جن کے اقتدار کا مظہر تخت و تاجِ آصفی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کا بادشاہ ایک ہی ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کو جب تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ تصورِ حیات جو قائدِ ملّت ہمیں دیا ہمارا محافظ ہوگا۔

قائدِ ملّت نے موت اپنے طلبے طے رکھی، زندگی آپ کے حوالے کر دی۔ زندگی جو ایک بلندی اور اقتدار کی حامل زندگی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ

ہماری تنظیم نہ ٹوٹ جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کوئی چند اشخاص کی تنظیم نہیں ہے جس کو ٹوٹ جانے کا کوئی اندیشہ ہو۔ تنظیم کی کی بنیاد ایک تصور حیات اور مقصد زندگی کا تصور ہے۔ اس تنظیم کی بنیاد ذہنوں پر ہے۔ اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ آپ میں کا ہر ایک شخص محافظ ہے۔ اشخاص آتے اور جاتے رہیں گے ہو سکتا ہے کہ شخصی خرابیاں پیدا ہوں لیکن یہ چیز ہماری تنظیم کو ہاتھ نہیں لگا سکتی، اصلاح کے لیے نگرانی اور نگرانی کے لیے ہم سب موجود ہیں۔

قائد ملت نے جہاں آپ کو بلند و باعظمت بنا دیا۔ شاہ ذی جاہ سے نسبت دے کر آپ کے وقار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہاں آپ کی زندگی بہت سے حقائق کی حامل ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہر باطل کی قوت سے ٹکرا جاتے تھے۔ شاہ منزل میں زلزلے آتے ہوئے ہم نے دیکھا ہے کہ حکومت کی کرسی اقتدار تحفہ بن کر آ رہی ہے۔ لیکن مرد مجاہد ہے کہ قبول نہیں کرتا۔ قائد ملت کی زندگی پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ عہدہ کے اقتدار کے پیچھے دوڑنا عزت نہیں ذلت ہے۔ ملت کی خدمت کرنا اور فنا ہو جانا ہی وہ عظمت ہے۔ جس کی پابوسی کے لیے خود عہدہ اقتدار چلا آتا ہے۔

قائد ملت نے بہت سے بت توڑے جن میں سے جھوٹے اقتدار کا بت بھی تھا۔ وہ جاگیردار پیدا ہوئے۔ لیکن اس ماحول سے نکل کر ایک ماحول پیدا کر لیا جس میں امارت اور سرمایہ داری کوئی چیز باقی نہ رہی۔

ہم نے دیکھا کہ ملت اسلامیہ کے اسی پلاٹ فارم پر کمال یار جنگ مرحوم

محاالقہ کرر ہے ہیں۔ دوست محمد خاں جاگیر دار آج ہماری محفل میں موجود ہیں قائد ملت کی زندگی نے یہ نقوشں مرتسم کیے۔ سچی عزت و عظمت اور امارت کا راز اس میں مضمر ہے کہ ملت کے لیے دولت راہ حق میں لٹا دیجئے، سب کچھ لٹا کر ہی ہم سب بلند ہو سکتے ہیں اور صحیح معنوں میں امیر بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی

بہادر یار جنگؒ

بہادر یار جنگ مرحوم کے مکان میں ان کی وفات سے چند دن قبل درس اقبال کی مجلس منعقد تھی مرحوم اس زمانہ میں شمالی ہند کے سفر سے واپس ہوئے تھے۔ کہنے لگے لاہور میں ایک عجیب واقعہ سننے میں آیا۔ علامہ اقبال کی رحلت کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ ایک درویش صفت بزرگ ان کے سرہانے آئے اور تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد ایک شعر پڑھا اور اسی طرح واپس ہو گئے۔ وہ شعر یہ تھا ؎

بس اتنی ہی حقیقت تھی فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ بن جائے

جس انداز سے مرحوم نے یہ واقعہ اور خصوصاً شعر سنایا تھا وہ اس قدر موثر تھا کہ حاضرین مجلس پر رقت طاری ہو گئی۔ لیکن اس موقع پر کسی کے

وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس شعر کا مضمون چند دن کے اندر خود ان کی اپنی ذات پر صادق آئے گا۔ اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے انھیں پندرہ برس بھی نہیں ہوئے ہیں لیکن سوائے چند اصحاب کے جن سے ان کے ذاتی تعلقات سیاسی نہیں بلکہ شخصی سطح پر استوار تھے دوسرے لوگوں کی زبان سے ان کا ذکر شاذونادر ہی سننے میں آتا ہے۔ اس قلیل عرصہ میں نہ صرف ان کی شخصیت نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے بلکہ ان کی گراں بہا خدمات بھی جو انھوں نے ملت اسلامیہ کے لیے انجام دی تھیں بہت کم لوگوں کو علم یا احساس ہے حالانکہ اپنی بے مثال خطابت اور خداداد فراست کے ذریعہ انھوں نے اس پورے برصغیر کے عامتہ المسلمین میں حریت اور آزادی کی جدوجہد کو تیز کر دیا تھا لیکن بعض حلقوں میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ حیدرآباد کے ایک مقامی لیڈر تھے اور بعض لوگ شاید اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ ان کی زندگی کے آخری چند سالوں میں خود حیدرآباد کے باشندوں کو ان سے ایک مستقل شکوہ یہ تھا کہ وہ اپنی توانائی اور وقت کا اکثر وبیشتر حصہ کل ہند مسائل کے لیے وقف کرتے اور حیدرآباد کے مسائل کے لیے بہت کم وقت نکال سکتے تھے ان لوگوں کو انھوں نے ہمیشہ یہ جواب دیا کہ حیدرآباد کے مسئلہ کا حل کل ہندوستان کے صحیح حل پر منحصر ہے۔ جن لوگوں نے ناگپور، دہلی، علی گڑھ، لاہور، کراچی اور پشاور کے جلسوں میں ان کی سحر بیانی کا مظاہرہ دیکھا ہے انھیں معلوم ہے کہ ایک مردِ مومن کے قلب کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے چند کلمات کس طرح مایوس اور ناامید انسانوں میں عزم واستقلال کی روح پھونک رہے تھے اور وہ اس امر کی شہادت دے سکتے ہیں کہ یہاں بہادر یار جنگ کی حیثیت ایک مقامی

رہنما کی نہیں بلکہ ایک سربرآوردہ کل ہند لیڈر کی تھی، قائداعظم جس طرح ان کو اپنا دست راست سمجھتے تھے اس سے بھی اکثر لوگ واقف ہیں اس بناء پر میرا خیال ہے کہ ان کی ناگہانی وفات صرف حیدرآباد کے لیے ہی نہیں بلکہ مسلمانان ہند کے لیے بھی ایک سانحہ عظیم تھی جس کا اثر اس ملک کی تاریخ پر بہت گہرا اور دوررس ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ مشیّت ایزدی سے کسی کو قبل از وقت واقفیت نہیں ہو سکتی اور اسی لیے یہ حکم لگانا ممکن نہیں کہ ان معاملات میں متبادل حالات کے تحت کیا ہوتا اور کیا نہ ہوتا لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کیا ہوتا اور ویسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اسی جذبہ کے زیر اثر بعض وقت بے اختیار یہ خیال آتا ہے کہ اگر موت کے ظالم ہاتھ بہادر یار جنگ کو ہم سے بے وقت نہ چھین لے جاتے تو حیدرآباد اور ہندوستان ــ پاکستان کی تاریخ پر کیا اثر پڑا ہوتا۔

مرحوم یہ مقولہ اکثر دہرایا کرتے تھے کہ مسلمان قوم بسا اوقات لڑائی جیت لیتی ہے لیکن صلح ہار جاتی ہے جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ تالیف قلب اور مروت خلوص اور صداقت، شرافت اور انسانیت کی خصوصیات کتنی افراط سے ان کی ذات میں جمع تھیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ بھی جو سیاست مذہب اور ملک کے معاملات میں ان سے اختلافات رکھتے تھے ان اختلافات کے باوجود ان کے گرویدہ تھے اور ان کی دیانت اور راست بازی اور انصاف پسندی پر یقین واثق رکھتے تھے۔ شدید ترین سیاسی کش مکش کے زمانہ میں بھی بہادر یار جنگ کے شخصی اور نجی تعلقات دوسری جماعتوں کے

قائدین سے نہایت دوستانہ تھے اور ان اختلافات کا اثر ذاتیات پر کچھ نہیں پڑا تھا۔ خود مسلم عوام پران کا اثر اس قدر زبردست تھا کہ لاکھوں آدمیوں کا بے قابو مجمع ان کے چند کلمات سن کر نظم و ضبط کے ساتھ واپس ہو جاتا تھا۔

وہ محض عوامی لیڈر ہی نہیں تھے بلکہ جن لوگوں کے ساتھ ان کا بچپن سے اٹھنا بیٹھنا تھا وہ ان کے سچے اور مخلص دوست تھے اور انتہائی معروفیت کے باوجود اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے یہاں تک کہ اپنے کسی عزیز دوست کی علالت یا کسی اور تکلیف کے وقت وہ گھنٹوں ان کے ساتھ گزار دیتے تھے یہی وہ وقت ہوتا تھا جب ان کے ہم نشینوں پر ان کی حقیقی خوبیاں روشن ہوتی تھیں۔

سرور کائنات رسول مقبول صلعم کی ذات والاصفات سے ان کو بے پناہ عقیدت تھی اور جب کبھی آنحضرت صلعم کا نام گرامی خود ان کی یا کسی اہل محفل کی زبان پر آتا تو غیر معمولی طور پر متاثر ہو جاتے۔ درس اقبال کی ایک نشست میں جب میں نے غالب کی مشہور غزل کا یہ شعر پڑھا کہ:

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است

لیکن کشاد روز کمان محمد است

تو ان کے سارے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا اور روتے روتے حالت دگرگوں ہو گئی یہاں تک کہ اہل محفل کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ کہیں حرکت قلب نہ رک جائے خود انھوں نے بھی نعت میں چند اشعار اور قطعات نہایت صدق دل سے عرض کیے تھے۔ امت مسلمہ کی فکر میں وہ ہمیشہ مستغرق رہتے تھے، اور اسی کی خاطر

انھوں نے اپنے خطاب، جاگیر اور مال و متاع سے دستبردار ہونے میں کوتاہی نہیں کی۔ عرب شاعر کے مشہور شعر کے مطابق ان کی موت ایک فرد واحد کی موت نہیں تھی بلکہ:

قوم کی ایک بنیاد تھی جو منہدم ہوگئی

بدر شکیب مرحوم

قائدِ مرحوم اور قیادت

قائد ملت محمد بہادر خاں علیہ رحمتہ کے سانحہ ارتحال نے ہندستان کی ایک زبردست شخصیت کو ہم سے چھین لیا ہے جس کی اس دورِ ابتلاء میں شدید ضرورت تھی اور جس نے ایک بہت ہی قلیل عرصے میں پورے ہندوستان کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قائدِ مرحوم کی مقبولیت کا راز ان کی خطابت تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ خطابت سے زیادہ ان میں خلوص تھا اور خلوص سے زیادہ ان میں قوتِ ایمانی تھی اور اس قوت ایمانی کے اظہار کے لیے قدرت نے انھیں زبان عطا کی تھی جس کی جادو بیانی سے انھوں نے ہزاروں قلوب کو مسخر کرلیا تھا اور ان میں عمل کی ایک روح پھونک دی تھی۔

دنیا کے مشہور اور برگزیدہ ہستیوں میں بہت کم ایسی مثالیں ملیں گی

کہ ان میں سے کسی نے ایک انتہائی قلیل مدت میں پوری قوم کی قیادت کا منصب حاصل کیا ہو. محمد بہادر خاں رحمتہ اللہ علیہ کی ترقی ایک دلچسپ داستان ہے کہ کس طرح ایک شخص جو بلحاظ ماحول بلحاظ تربیت اور بلحاظ حالات ملک اپنے آبائی راستہ کو چھوڑ کر قوم کی خدمت کے لیے ایک دوسری ڈگر اختیار کرتا ہے. میٹرک بھی کامیاب نہیں کرنے پائے تھے کہ والد کا سایہ سے سر اٹھ گیا اور جاگیر، خاندان اور والد کے قرض کی ادائی کی ذمہ داری ان نوجوان کندھوں پر رکھ دی گئی. یہی وہ پہلی آزمائش تھی کہ مرد خدا امتحان میں کامیاب اترا. گو باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا. لیکن ذاتی مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ ادب، فلسفہ تاریخ اور مذہبیات کی کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کی نظر سے نہ گزری ہو.

۱۹۳۵ء تک محمد بہادر خاں ایک طرح گوشہ گمنامی میں تھے. ایک مبلغ اسلام اور مذہبی مقرر سے زیادہ ان کی حیثیت نمایاں نہ ہوئی تھی مذہبی تقاریب اور سیرت کے جلسے ان کی آماجگاہ تھے جس سلسلہ میں حیدرآباد کے اضلاع سے بھی وہ کافی روشناس ہو چکے تھے. یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حیدرآباد کی سیاسی فضا آریہ سماجی پروپگنڈہ کی وجہ سے کافی مسموم ہو چکی تھی. حیدرآباد کے ہندو اور مسلمان جو اب تک معاشی سماجی اور تمدنی اعتبار سے ایک تھے اس میں رفتہ رفتہ خلیج پیدا ہو کر انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے کانگریس کی ریاستوں میں فرقہ وارانہ حکومت کی تائید نے ریاستی عوام خصوصاً حیدرآباد کے ہندوؤں میں ایک جذبۂ اقتدار پیدا کر دیا تھا جس سے ایک طرف وہ حیدرآباد کی حکومت سے نبرد آزما ہوئے تو دوسری طرف مسلمانوں

کو بھی انھوں نے اپنا مدِمقابل قرار دے دیا۔ پورے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں منافرت کی آگ مشتعل تھی۔ ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ہندو مسلم فسادات برپا تھے۔ اس آگ کے بڑھتے ہوئے شعلوں سے حیدرآباد کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ فسادات کے لیے حیدرآباد کی زمین تیار ہو چکی تھی ایک چنگاری کی دیر تھی جس کے ساتھ ہی حیدرآباد میں فسادات رونما ہوئے۔ ان فسادات کا سب سے دردناک پہلو یہ تھا کہ خود قائدِ ملت کے دو بھانجے ہندو فسادیوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ ان دونوں شہیدوں کی میت کا جلوس نکالا گیا جس میں ہزارہا مسلمانوں نے شرکت کی۔ مسلمان انتہائی برافروختہ اور مشتعل تھے اور اگر اس مجمع کو صحیح طور پر قابو میں نہیں رکھا جاتا تو حیدرآباد کے گلی کوچوں میں ہندوؤں کے خون سے وہ ہولی کھیلی جاتی جس کی مثال ہندوستان کے کسی شہر میں نہ ملتی لیکن مسلمانوں میں قیادت پیدا ہو چکی تھی اور مشیت نے اس منصب کے لیے محمد بہادر خاں کو منتخب کر لیا تھا جس نے چشم زدن میں اپنی ایک تقریر سے انتہائی مشتعل مجمع میں تنظیم کی وہ کیفیت پیدا کر دی تھی کہ جو تلواریں نیام سے نکل گئی تھیں وہ دیکھتے ہی دیکھتے نیام میں چلی گئیں اشتعال کی جگہ تدبر نے لے لی، اور دنیا نے دیکھا کہ کس طرح ایک شخص کی آواز پر مسلمانوں نے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا۔

فسادات کی مسموم فضا کو صاف کرنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کی جا رہی تھیں جس میں سب سے اہم حصہ محمد عبدالرحمٰن رئیس مدیر روزنامہ وقت کا تھا جنھوں نے خود کو جوکھم میں ڈال کر اور متاثرہ محلوں میں گشت لگا کر مسلمانوں

کے احساسات کی صحیح ترجمانی کی اور اس طرح اپنے بے لوث کردار کے صحیح جذبۂ اسلامی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وکالت شروع کیے ہوئے کچھ دن ہوئے کچھ دن ہوئے تھے شہر سنسان تھا ایک مکمل ہڑتال کی کیفیت طاری تھی۔ میں دفتر اخبار وقت میں فسادات کے حالات سے باخبر ہونے کے لیے گیا ہوا تھا شام کا وقت تھا حیدرآباد کے پانچ چھ ہندو لیڈر جمع تھے۔ ناظم اول فوجداری بلدہ بھی آ چکے تھے۔ پولیس کے کچھ عہدیدار بھی موجود تھے ایسے میں محمد بہادر خاں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائے، مجمع تعظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ قائدِ مرحوم نے ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملاقات فرمائی اور جب فسادات کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو میں نے محسوس کیا کہ قائد مرحوم کی تنہا ذات کے مقابلہ میں جملہ ہندو لیڈر مل کر بھی اپنی بے مائگی کا ثبوت دے رہے تھے اور ان میں کے ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ بدقسمتی سے ہندوؤں میں کوئی ایک شخص نہیں ہے جس کو اپنی قوم میں وہ اعتماد حاصل ہو جیسا قائدِ مرحوم کو مسلمانوں میں ہے ہر شخص قائدِ ملت کی طرف آس لگائے بیٹھا تھا اور یہ محسوس کر رہا تھا کہ حکومت کی پوری مشنری کے باوجود فسادات پر قابو پایا جاسکتا تھا تو وہ صرف قائدِ ملت کی مساعی سے ممکن ہے۔۔ یہیں سے محمد بہادر خاں کی قیادت کا صحیح طور پر آغاز ہوتا ہے اور دکن کی سرزمین کو جو ایک قائد کے لیے مدتوں سے بے تاب تھی ایک قائد مل جاتا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمان باوجود دکن میں حکمران ہونے کے انتہائی پریشان حال تھے۔ حکومت باوجود مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہونے کے مسلمانوں سے بیگانہ تھی۔ کہنے کو ملک میں امرا اور اعلیٰ عہدیداروں کی کمی

یہ تھی جو مسلمانوں کا نام لے کر اپنے ذاتی مفادات کو آگے بڑھانے میں معروف تھے لیکن مسلمانوں میں کوئی ایک شخص ایسا نہیں تھا جس کے دل میں قومی درد ہو جس کا ضمیر پاک اور جس کی نیت بخیر ہو۔ عام مسلمان مفلوک الحال تھے۔ ان کے مسائل سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی لیکن جب عنان قیادت محمد بہادر خاں کے ہاتھ آیا تو دنیا نے دیکھ لیا کہ اس مرد مجاہد نے کس طرح مسلمانوں کی قسمت کو سلجھا دیا۔ اور چار پانچ سال کے قلیل عرصہ میں مسلمانوں میں اس کی وجہ سے کایا پلٹ ہو گئی قدرت جب دنیا میں کسی شخص سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے تو پہلے سے اس شخص میں اس کام کے جوہر ودیعت کر دیتی ہے محمد بہادر خاں کو قدرت نے قیادت کے لیے منتخب کر لیا تھا اس لیے ابتدا ہی سے اُن کے عمل میں قیادت جھلکیاں لیتی نظر آتی ہے۔ حیدرآباد کے مذکور بالا ہندو مسلم فسادات کے بہت دنوں پہلے کا اور ایک واقعہ ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح محمد بہادر خاں قیادت کے لیے تیار کیے جا رہے تھے۔ سر اکبر حیدری کے دور صدارت عظمیٰ میں جدید معاہدہ برار کی تجدید عمل میں آئی جس کے ذریعہ سے دواماً برار پر حیدرآباد کا تسلط ختم ہو گیا اس جدید معاہدہ کے انعقاد کے سلسلہ میں سر اکبر کے ایماء پر ایک پبلک جلسہ اعلیٰ حضرت بندگان اقدس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ٹاؤن ہال میں ترتیب دیا گیا جس کے صدر دیوان بہادر آرمو دا آئینگار مقرر ہوئے شکریہ کی تحریک کے موئدین میں نواب بہادر یار جنگ بھی تھے۔ ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ اس معاہدہ اور جلسہ کے خلاف تھا چنانچہ اس جلسہ کو ناکام کرنے کی اندرونی طور پر ایک مہم شروع کی گئی تھی۔ جلسہ کا آغاز ہوتا

ہے کہ سامعین میں سے مولوی میر حسن الدین صاحب مدیر مملکت ہفتہ وار اعتراض کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ بانیان جلسہ اور مقررین میں ایک کھلبلی مچ جاتی ہے۔ پبلک کا مطالبہ ہوتا ہے کہ تحریک تشکر میں ترمیم کی جائے۔ ایسے میں نواب بہادر یار جنگ کی باری آتی ہے۔ زبان سے تحریک کی تائید میں چند جملے نکلنے نہیں پائے ہیں کہ نواب صاحب مجمع کے چشم و ابرو کے اشاروں کو بھانپ لیتے ہیں معاہدہ برار کے پورے تاریخی منظر کا نواب مرحوم چشم بر دن میں جائزہ لیتے ہیں۔ صحیح احساسِ صداقت جاگ اٹھتا ہے اور وہی شخص جو تحریک کی تائید میں تقریر شروع کر چکتا ہے پلک جھپکنے کی دیر میں اپنے صحیح مقام کو پہچان کر تحریک اور جدید معاہدہ کی دھجیاں ادھیڑ دیتا ہے مجمع کی آواز جس شخص کے خلاف مخالفت میں اٹھتی ہے تحسین میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

سید محمد اکبر وفاقانی مرحوم (بی اے۔ ایل ایل بی)

ہمارا نواب

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اک شب ہی میں پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

ہماری نظر میں صرف ایک ہی نواب تھا۔ اور وہ بہادر خاں

المخاطب بہ بہادر یار جنگ تھا۔ لفظ نواب میں لیڈر، رہبر، حکیم، طاقتور شخصیت اور ہیرو کے معنی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سرحدی نژاد بلند قامت، بھاری بھر کم نوجوان کو سب سے پہلے زمانہ طالب علمی دیکھا تھا دارالعلوم جامعہ عثمانیہ کے لیے سب سے پہلا مدرسہ فوقانیہ تھا اور اس وقت میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ اس زمانہ میں منشی اور مولوی کامیاب طلبا کو یہ اجازت تھی کہ وہ صرف انگریزی کا پرچہ کامیاب کر کے میٹرک کی سند حاصل کر لیں۔ انھیں طلبا میں بہادر خاں بھی تھا۔

شریف حسین، جمال الدین، عبداللطیف، عبداللہ مسدوسی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، سید ابراہیم وہ طالب علم تھے جن کے ساتھ ایک اعلیٰ جاگیردار خاندان کا فرد بھی تعلیم پا رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اس زمانہ میں شریف حسین جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں ورزش جسمانی کے انسٹرکٹر تھے ایک خاصے پہلوان تھے جو قد و قامت میں بہادر خاں سے کچھ کم نہ تھے۔ دوپہر کے وقفہ میں ان دونوں کو ورزش کرتے میں نے دیکھا ہے۔ کشتی، پنجہ کشی، مگدر زوری ان لوگوں کا مشغلہ تھا۔ مجھ سا کمزور جسم کا آدمی ان دو ہاتھیوں کی ٹکر کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں میں انھیں رستم و سہراب کے ثانی محسوس کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

کس کو معلوم تھا کہ دارالعلوم کا یہ پہلوان سیاست اور خطابت کا رستم بنے گا اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے سرزمین دکن کا وہ ہیرو ثابت ہوگا جس کے مقابلے میں سوائے ٹیپو سلطان کے کوئی دوسری اتنی بڑی شخصیت دکن کے مسلمانوں میں نظر آئے گی۔

بہادر یار جنگ اور ٹیپو سلطان میں کئی مماثل خصوصیات تھیں۔ دونوں نے نامساعد زمانہ میں مسلمانانِ دکن اور بالواسطہ مسلمانانِ ہند کو دوبارہ اوجِ کمال تک پہنچانے کی سر توڑ کوشش کی اور دونوں آصف جاہی سازشوں کا شکار ہوئے ایک نے سنتِ حسینی پوری کی اور دوسرے نے سنتِ حسنی۔

تاریخ اسلام میں سرورِ کائنات کے دونوں نواسے مومن کے عمل کے نمونے ہیں صداقت کے لیے طاغوتی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کا سبق انہیں دو بارگاہوں سے حاصل ہوتا ہے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ دو بڑے ذکی دماغ ان بزرگ ہستیوں کے راستے پر گامزن ہوئے اور ثابت کر دکھایا کہ اسلام ہر زمانہ میں شہیدوں کے سچے پیرو پیدا کرتا ہے۔ میں نے نواب کو پہلی مرتبہ سنہ ۳۰ء میں دیکھا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہم نے کالج کی نیم پختہ تعلیم حاصل کر کے سند حاصل کی تھی اور علم و حکمت کا گھمنڈ سر میں لیے ہوئے حیدرآباد کی سڑکوں پر اس طرح گھومتے تھے جس طرح سقراط، ایتھنز کی گلیوں میں گھوما کرتا تھا۔ ہر خود غلط نوجوانوں کی نظر میں دنیا کا بڑے سے بڑا آدمی ہیچ ہوتا ہے۔ کالج میں کوئی عصرانہ تھا۔ وہاں سے لوٹ کر عابد شاپ آئے۔ اس وسیع وعریض . . . سڑک کی ایک جانب نظامیہ ریستوران کے میدان میں بڑے بڑے شامیانے دیکھے معلوم ہوا کہ میلاد النبی صلعم کا جلسہ ہے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آلہ مکبر الصوت (SPEAKER) کی مدد کے بغیر مقرر کو اپنی آواز دور نزدیک کے سامعین تک پہنچانی پڑتی تھی۔ اس میں اکثر مقررین ناکام رہا کرتے تھے۔

ہم ابھی اس مقام سے دو سو قدم دور ہی تھے کہ ایک بلند آواز

ہمارے کانوں میں آئی، ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ جلسہ میں ایک ایسا مقرر بھی ہے جس کی آواز صرف سامعین تک ہی نہیں پہنچتی بلکہ بیرونی دنیا تک پہنچتی ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہی آواز کشمیر کی وادی میں گونجے گی۔ سرحد کے پہاڑوں میں زلزلہ پیدا کرے گی اور راوی کے کنارے وہ نعرہ تکبیر لگائے گی۔ جس کی وجہ سے ایک اولوالعزم خواب حقیقت بن گیا اس جلسہ میں رئیس حیدرآباد بھی موجود تھے جو جیکل اینڈ ہائیڈ کی شخصیتوں کا مرکب تھے۔ اس زمانہ میں ان کا زبردست رعب کارفرما تھا۔ انھوں نے اس نوجوان خطیب کی تقریر سنی۔ حقیقی داد دی اور ایک نوعمر صاحب جاگیر کو بہادر یار جنگ کے خطاب سے نوازا جو بعد میں چل کر ہمارے دلوں پر ایسا مرتسم ہوا کہ آج بھی انھیں بہادر یار جنگ بولتے ہیں حالانکہ ان کا اصل نام بہادر خاں ہے۔ اور انھوں نے خطاب واپس کر دیا تھا۔ اگر ہم اس بڑی شخصیت کو صرف بہادر خاں کہیں تو ہمارا ضمیر اسے ان کی شان گستاخی سمجھتا ہے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس مقرر سے متعلق ایسی رائے قائم کی تھی جس پر آج ہنسی آتی ہے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ یہ نوجوان ابوالکلام آزاد کے مضامین رٹ کر بہت خوبصورت انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ ہم غور کرتے ہیں تو ہم پر خود اپنی کمزوریوں اور خود نمائیوں کا راز کھل جاتا ہے۔

ایک مستقبل کا خطیب، مقرر اور متقی انسان آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا خاص طور پر ان لوگوں میں جو بچپن سے اس کو دیکھ چکے ہیں۔ بیسویں صدی کے صرف پانچ سال گزرے تھے کہ اس صدی کا سب سے بڑا اردو مقرر اور خطیب پیدا ہوا۔ ابتدائی تربیت ٹھاٹ باٹ سے ہوئی میٹرک تک

ان کی تعلیم ویسی ہی رہی جیسی کہ ایک وارث جاگیر کی ہوتی ہے لیکن چونکہ پٹھان خاندان سے تھے اس لیے فنِ سپہ گری، ورزش اور کشتی کے فن میں ماہر بنائے گئے۔

ان کی اصلی زندگی شروع ہوتی ہے ان کے والد کے انتقال کے بعد سے جب کہ جاگیر کے انتظام کا بوجھ اس نوجوان پر پڑا۔ مذہبی زندگی کی طرف میلان شروع ہی سے تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھ میں جذبہ اسلامی اور جذبہ انسانی میری نانی نے پیدا کیا۔ بہادر خاں نے جاگیر کا انتظام سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کمال معاملہ فہمی سے جاگیر کے قرضوں کی ادائی کی اور اس کے بعد قومی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حیدر آباد میں سیاسی شعور کروٹ لے رہا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام نے حیدر آباد کے متوسط اور ادنیٰ طبقہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ اور مدت سے دبے ہوئے مسلم طبقات میں حقوق کے حصول کا جذبہ پیدا کیا۔ ادھر کانگریس کی وجہ سے ریاست کے ہندوؤں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی رہیں ۔۔۔ یعنی برطانوی ریشہ دوانیاں اپنے اوج پر تھیں۔ اس زمانے میں وہی شخص دنیوی حیثیت سے بڑھا تھا جو ریذیڈنٹ تو بڑی چیز تھی اس کے ٹیلر کو خوش رکھتا۔

حیدر آباد دوہری غلامی کا شکار تھا۔ برطانوی ہند پر انگریز کا راج تھا اور ریاستوں پر انگریزوں کے غلاموں کا۔ بہادر خاں نے دیکھا کہ ان حالات میں سیاست میں راست دخل دینا غلط ہے۔ ان کے سامنے اس وقت دو چیزیں تھیں ایک تو اپنی شخصیت کو اس حد تک ترقی دینا کہ لوگ ان کی رہنمائی قبول کریں۔ دوسری حیدر آبادی مسلمانوں کو بیدار کرنا۔ انہوں نے سب سے

پہلے اس بات کی کوشش کی کہ حیدرآباد میں ہندو مسلم مسئلہ کو حل کریں ان کا خیال تھا کہ اگر ریاست میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر بھی ہو جائے تو آنے والی مشکلات کا سدباب ہو سکے گا۔ چنانچہ بہادر یار جنگ نے اپنی پوری صلاحیتیں تبلیغی کاموں میں صرف کرنی شروع کیں اور تنہا اپنی کوششوں سے تیس ہزار غیر مسلموں کو مسلمان بنایا۔ لیکن چونکہ کانگریس بیدار تھی اس لیے اس کی طرف سے سخت مقاومت ہوی۔ اس نے اس تبلیغی مہم کے خلاف سخت احتجاج کیا اس پر ریزیڈنٹ نے تبلیغی کام روک دیا۔ جس انجمن اسلامیہ نے اس مہم کا آغاز کیا تھا وہ پھر ملاؤں کی جماعت بن کر رہ گئی۔

۱۹۳۲ء میں نواب صاحب نے ممالک اسلامیہ کا دورہ کیا۔ یہاں نواب بہادر خاں نے اپنی خطابت کا کمال دکھایا۔ مصر میں نواب ممدوح نے عربی میں خطبہ دیا جس کی شہرت سارے عربی دال ممالک میں ہوی اور رعربول نے کہنا شروع کیا کہ ایک عجمی عربی اس طرح بولتا ہے کہ خود اہل زبان رشک کرنے لگتے ہیں۔ اس دورے نے نواب صاحب کے ارادوں میں بڑی وسعت پیدا کی اور مشرق وسطیٰ کی گندی سیاست اور اخلاقی ابتذال نے ان پر گہرا اثر چھوڑا۔ اس سفر سے واپسی پر انہوں نے اپنا اصلی کام شروع کیا اسی زمانہ میں ایک چھوٹی سی انجمن محمود احمد خاں اور بہاءالدین نے قائم کی جس کا مقصد مسلمانوں کو مذہب پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دینا تھا۔

نواب صاحب نے اس انجمن کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۳۲ء سے ۳۵ء تک بہادر یار جنگ نے تمام ممالک محروسہ نظام کا دورہ کر کے

اضلاع میں مجلس اتحاد المسلمین کی شاخیں کھول لیں اور اس میں ایسی تنظیم پیدا کی کہ ہندوستان کی کوئی دوسری تحریک اس کا جواب پیش نہیں کر سکتی۔

۱۹۳۱ء سے بہادر یار جنگ نے حیدر آباد سے باہر کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور قائد اعظم کے دستِ راست بن گئے اور اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں کہ ان سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات بیان کروں، صرف اس قدر عرض کروں گا کہ بہادر یار جنگ کی موت مسلمانان حیدر آباد کی نہیں مسلمانان جنوبی ہند کی موت تھی۔ ٹیپو کا جانشین مشیر آباد کے دائرے میں زیرِ خواب ہے۔

احمد خاں۔ بی اے، ایل ایل بی

پاکستان کا نقیب

بہادر یار جنگ کی جاذب شخصیت کا ٹھپہ دکن ہی پر نہیں ہندوستان کے طول و عرض اور مسلمانان ہند کی اجتماعی زندگی پر اتنا گہرا ہے کہ شاید صدیوں تک نہ مٹ سکے۔ یوں تو ایک عرصہ قبل برطانوی ہندان سے متعارف تھا لیکن سیاسی و اجتماعی تعلقات کی ابتداء مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ ہوئی۔ حیدر آباد کے خلاف کانگریس مہا سبھا، آریہ سماج نے جس جنگ کا اعلان کیا تھا اس کی روک تھام کرنے مسلمانانِ ہند اور اکابرِ مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں شرکت کی۔ یہ زمانہ مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کا تھا اور زعمائے لیگ کے سامنے پاکستان

جیسا واضح و معین نصب العین نہیں تھا۔ ان کے دلوں پر ابھی تک جمہوریت کا بھوت چھایا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کو صرف ایک فرقہ ہی سمجھتے تھے اور ان کی علیحدہ قومیت کا واضح شعور ان کے ذہنوں میں نہ تھا۔ اس لیے جب حیدرآباد کا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ پہلے پہل ہچکچائے۔ جمہوریت و ذمہ دارانہ حکومت کی مخالفت کو وہ بیسویں صدی عیسوی میں امر محال سمجھتے تھے لیکن حیدرآبادی وفد کے قائد نے تشریح کی کہ جمہوریت لازمی طور پر ہر ملک کے لیے مفید طرز حکومت نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف سروں کو گننے کا نام ہے۔ یہ طرز حکومت اسی جگہ مفید ہو سکتا ہے جہاں صرف ایک قوم آباد ہو، لیکن ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں ہندو و مسلمان بستی ہیں۔ بادشاہ کو اوتار سمجھنے والی ہندو قوم جمہوریت کی حامی محض اس لیے ہے کہ وہ سروں کو گن کر اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں منتقل کر لینا چاہتی ہے۔ ان خیالات نے زعمائے مسلم لیگ کے ذہنوں سے نقاب الٹ دی وہ نہ صرف حیدرآباد کی اخلاقی امداد کے لیے تیار ہو گئے بلکہ اپنے سیاسی مسلک پر انھوں نے از سر نو غور کرنا شروع کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد قائداعظم محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ پارلیمانی طرز حکومت ہندوستانی عوام کے لیے موزوں نہیں ہے اس اعلان کے بعد مسلم ہند کی سیاست ایک موڑ پر آگئی۔ جمہوریت کے بھوت کا خوف قائدین لیگ کے ذہن سے زائل ہو چکا تھا اور ایک جداگانہ جمہوریت کا شعور مسلم عوام میں پوری طرح جاگ اٹھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کی قرارداد مسلم لیگ کے جلسہ میں پاس کی گئی، اگرچہ یہ قرارداد لاہور میں منظور ہوئی۔ لیکن اس کے جراثیم پٹنہ ہی میں پرورش پائے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانان ہند کے لیے

پاکستان کی راہ ہموار کرنے میں بہادر یار جنگ کا ہاتھ بھی کام کر رہا تھا۔ لاہور کے پاکستانی اجلاس میں بہادر یار جنگ نے قائد اعظم کے ارشاد کی تکمیل میں معرکۃ الآرا تقریر کی اور مسلمانوں کے دلوں پر ایک غیر فانی نقش چھوڑ دیا حتیٰ کہ قائد اعظم کو کہنا پڑا کہ بہادر یار جنگ کے بعد کسی اور کا بولنا غلطی ہے۔ قرارداد لاہور کے بعد سے قائد ملت نے اپنی ممکنہ خدمات مسلم لیگ کے لیے دیں۔ لیگ کے اہم اجلاسوں میں ان کی شرکت ناگزیر تصور کی جاتی تھی اور اس کے سالانہ اجلاسوں کی رونق ان ہی کی شعلہ نوازیوں پر موقوف رہنے لگی۔ مدراس الہ آباد، دہلی، کراچی غرض جہاں کہیں وہ تقریر کرتے لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے اور یہ مقامات ان کے مفتوحہ ہوتے ان کی جادو اثر تقریروں نے مسلمانانِ ہند کے قلوب میں آگ لگا دی تھی۔

حبیب اللہ اوج سابق ایڈیٹر اخبار "میزان" حیدرآباد۔ "پاک جمہوریت" کراچی

قائدِ ملت بہادر یار جنگ مرحوم

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

آئیے آئیے اوج صاحب میں آپ کے معرعہ کا لطف اٹھا رہا تھا۔ ان حوصلہ افزا الفاظ کے ساتھ ایک قدآور، وجیہ اور دلکش شخصیت نے دل کو موہ لینے والے تبسم سے میرا خیر مقدم کیا۔ چونکہ ملاقاتی سے وقت مقرر

ہو چکا تھا اس لیے میں نے ایک پرزہ کاغذ پر اپنی آمد کی اطلاع جن الفاظ میں دی تھی وہ اتفاقیہ ایک مصرعہ کی صورت اختیار کر گئے تھے "حسب ارشاد اوج حاضر ہے۔" اونچا قد، بھرا بھرا جسم، سرخ سپید رنگت، کشادہ پیشانی روشن اور متبسم چہرہ، چمکدار آنکھیں، سنہری رنگت لی ہوئی ڈاڑھی جو ان کے چہرے پر کھلی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ سرو قد کھڑے ہوئے تو ان کے سامنے یوں محسوس کرتا تھا جیسے اللہ دین الف لیلیٰ جن کے سامنے کھڑا ہے اور جب گرمجوشی سے انھوں نے مصافحہ کیا تو ان کے کشادہ اور مضبوط ہاتھوں سے میرا مصافحہ یوں لگتا تھا جیسے بالشتیوں کا کوئی فرد گلیور سے مصافحہ کر رہا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں میرے نزدیک بڑے آدمیوں کا تصوّر محض یہ تھا کہ وہ قدآور ہو، وجیہہ ہو، بھاری بھرکم جسم کا مالک ہو اس کا چہرہ بارعب ہو مگر اس کے ساتھ ساتھ دلکش بھی ہو۔

میں نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ نواب بہادر یار جنگ بڑے آدمی ہیں اور بڑے آدمی سے ملاقات کی تمنا دل میں ہمیشہ مچلتی تھی۔ اپنی اس طفلانہ خواہش کے پیش نظر جب میں نے پہلی بار انھیں دیکھا تو ان کے قد و قامت وجاہت اور شخصیت کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ بہادر یار جنگ واقعی بڑے آدمی ہیں لیکن میں نے جس ملاقات کا ذکر کیا ہے وہ پہلی ملاقات نہ تھی۔ یہ اس ملاقات کا ذکر ہے جب نواب صاحب نے اپنی جاگیر اور خطاب بمصداق "عطائے تو بہ لقائے تو" نظام دکن کو لوٹا دیا تھا اور نواب بہادر یار جنگ کے بجائے وہ صرف بہادر خاں کہلوانا پسند کرتے تھے۔

ملاقات کے کمرہ میں ان ہی کے محلے کا ایک سیٹھ اپنی لڑکی کی شادی

میں شرکت کا نیوتا دے رہا تھا۔ اسے رخصت کرنے کے بعد بہادر خاں نے مجھے میری درخواست پر (میں ان دنوں اخبار میزان کا ایڈیٹر تھا) مجھے اس خط کا کچھ اقتباس پڑھ کر سنایا جس کے مندرجات کا علم ہونے پر وزیر پیشی نے اس کو نظام دکن تک لے جانے سے اس بناء پر انکار کر دیا کہ شاید نظام دکن اس پر برس پڑیں۔

نواب بہادر یار جنگ نے یہ قدم نظام حیدرآباد کے اس فرمان کے جواب میں اٹھایا جس میں متنبہ کیا گیا تھا کہ خطاب یافتہ جاگیرداروں کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائیں نواب صاحب نے نظام دکن کو یاد دلایا تھا کہ ان کے جد امجد کو یہ جاگیر اس سلسلے میں عطا ہوئی تھی کہ انھوں نے نظام کے جد امجد کی نہ صرف جان بچائی تھی بلکہ انھیں تخت نشین ہونے میں مدد دی تھی۔ درآں حالیکہ اگر وہ چاہتے تو اپنی طاقت کے بل پر خود تخت نشین ہوتے اور پھر خطاب اور جاگیر لوٹاتا کہ انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا جو سر اس جاگیر کے بوجھ سے خدا مجازی کے سامنے بھی خم ہوتا تھا، اب وہ صرف خدائے حقیقی کے سامنے جھکے گا۔

قدرت کے کام بڑے نرالے ہیں۔ کبھی فرعون کے گھر میں وہ حضرت موسیٰ کا اہتمام کرتی ہے تو کبھی نوح جیسے پیغمبر کے گھر میں بمام اور رصام جنم دیتی ہے۔

حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ یہ خوشحال جاگیرداروں کی بستی تھی جو عیش و عشرت کی فضا میں بستے اور جوان ہوتے تو آبائی خطاب سے نوازے جاتے۔ شاہان آصفیہ کی رواداری کا یہ نتیجہ تھا کہ یہ خطہ ہندو مسلم اتحاد کا گہوارہ بنا ہوا تھا اور ایسے وقت بھی

رواداری اور اتحاد کا درس دے رہا تھا اور جب کہ سارا ہندوستان فرقہ واریت کا مجموعہ بنا ہوا تھا. مگر جب پڑوس میں آگ لگ رہی ہو تو اس کی تپش دور دور تک محسوس ہوتی ہے. حیدرآباد میں بھی یہی ہوا.

لیکن قدرت نے روایاتی عیش پسند جاگیردار طبقے میں بہادر خاں جیسا مرد بینا اور مومن پیدا کر دیا جس نے مسلمانان دکن میں اتحاد اور جذبۂ حریت کو بیدار کیا. انھیں ایک جھنڈے تلے جمع کیا. انھیں ایک نعرہ دیا اور اس نعرے کی خاطر جینا مرنا سکھایا. افسوس ہے کہ اس کی عمر نے وفا نہ کی وہ کام ادھورا چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملا. ع

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

جاگیرداروں اور نوابوں کی پرورش عام طور پر اس ماحول میں نہیں ہوتی کہ ان کے کان عہد طفولیت ہی سے ان کے ہوا خواہوں اور ان کے دسترخوان کے ریزہ چینوں اور حواریوں کی مبالغہ آمیز تعریف چاپلوسی اور خوشامد کے کلمات سے آشنا ہوتے ہیں لیکن بہادر خاں اس افتادِ طبع سے یکسر مختلف تھے. وہ حیدرآباد کے مسلمانوں کی واحد اور سب سے بڑی جماعت اتحاد المسلمین کے صدر تھے. ایک بار مجلس کا اجلاس عام حیدرآباد دکن کے ایک مشہور وکیل اکبر یار جنگ کی صدارت میں ہو رہا تھا. لاکھوں کا مجمع قائد ملت کی تقریر سننے کے لیے موجود تھا. بہادر خاں اسٹیج پر موجود تھے اتنے میں ایک کرسی صدارت سے اعلان ہوا کہ ایک نوجوان شاعر اپنی نظم پیش کریں گے. بہادر خاں خود شاعر تھے اور نوجوان شعراء کی ہمت افزائی کرتے تھے. وہ سنبھل کر بیٹھ گئے. شاعر نے پہلا شعر

خوش الحانی سے پڑھا ہی تھا کہ بہادر خاں بے چین ہو گئے۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور چہرہ پر شکن پڑ گئی لیکن جوں ہی شاعر نے دوسرا شعر پڑھا بہادر خاں بے اختیار رونے لگے اور روتے ہوئے انھوں نے صدر سے درخواست کی کہ شاعر کو نظم پڑھنے سے روک دیا جائے۔ عجیب نظارہ تھا بہادر یار جنگ کے رونے کی آواز مائیکروفون سے نشر ہو رہی تھی اور نواب صاحب صدر اجلاس سے ہچکیوں کے درمیان رسول مقبول کی اس حدیث کا واسطہ دے کر شاعر کو خاموش کرانے کی التجا کر رہے تھے کہ: "مومن کے منہ پر اس کی تعریف کرانا اس کے ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔" جوان شاعر نے اپنے رہنما کے حضور جو خراج تحسین پیش کیا تھا مجمع نے اس کے صرف دو شعر سنے تھے جو مجھے آج بھی یاد ہیں ؎

اے مسلمانوں کے پیارے اے بہادر یار جنگ
رحمتیں نازل ہوں تجھ پر اے بہادر یار جنگ
خدمت اسلام کا تو کر رہا ہے حق ادا
دے رہے ہوں گے دعا تجھ کو محمد مصطفیٰ

شاعر نواب صاحب کے احساسات کا پاس کرتا ہوا اسٹیج پر سے اتر آیا۔ صدر جلسہ نے تلافی کے طور پر بہت کچھ کہنے کی کوشش کی مگر بہادر خاں کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ان کے قلب پر ان اشعار سے جو چوٹ لگی تھی اس کے اثرات ان کی اس روز کی تقریر سے بھی ہویدا تھے۔ طالب علمی کے دور میں بھی کبھی کبھار ان کے دولت خانہ ... "بیت الامت" میں بھی حاضری دیتا تھا۔ بیت الامت کے وسیع برآمدہ میں

چاروں طرف کرسیاں بچھی رہتی تھیں اور وہاں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ بہادر خاں ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کرتے۔ اس کے بعد ایسی عالمانہ گفتگو چھڑ جاتی کہ ع

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کراچی کے اجلاس مسلم لیگ میں شمولیت کی تیاری کر رہے تھے اس زمانہ میں ہی میں نے حضرت قائد اعظم کی خدمت میں ایک منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا اور میری دلی تمنا تھی کہ قائد اعظم کے جاں نثار اور سب سے بڑے مداح بہادر خاں کو پیش کروں چنانچہ میں نے یہ نظم خوشخط لکھوا کر فریم میں جڑوائی نظم کے وسط میں قائد اعظم کی ایک تصویر چسپاں کروائی اور نظم کو کاغذ میں لپیٹ کر بیت الامت روانہ ہوا۔ وہاں حسب معمول ۳۰، ۴۰ افراد تشریف رکھتے تھے حسب دستور بہادر خاں نے مسکراہٹ سے استقبال کیا اور کرسی کی طرف اشارہ کر کے باتوں میں مشغول ہو گئے مگر انہوں نے دو ایک بار معنی خیز نگاہوں سے ان کی چیز کی طرف دیکھا جو میرے ہاتھ میں اخبار میں لپٹی ہوئی تھی اور فریم شدہ نظم لے کر ان کی طرف بڑھا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مسکراہٹ کی جگہ ناراضگی نے لے لی۔ اور ایک ایسے لہجہ میں جس سے ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے انہوں نے دور ہی سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ میں آگے بڑھا اور انہیں بڑے ادب سے فریم پیش کیا۔ ان کا چہرہ فرط مسرت سے چمک اٹھا۔ اب ان کی یہ حالت تھی کہ نظم کا ایک ایک شعر پڑھ رہے ہیں اور داد دیتے جا رہے ہیں، حاضرین کو سنا رہے ہیں اور ان سے بھی داد چاہتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں شاعر نہیں نک بندی کر سکتا تھا۔ یہ نظم بھی طالب علمی کے جوش اور قائد اعظم سے انتہائی محبت و عقیدت کا مظہر تھی

جو دکن اور دکن ہی کیا سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو قائدِ اعظم سے تھی۔ اسی لیے نواب صاحب کی زبان سے اپنے اشعار کی تعریف سن کر میں زمین میں گڑا جا رہا تھا ایک شعر جس کی انھوں نے بہت تعریف کی یہ تھا ؎

چوم لیتی ہے سیاست فخر سے تیرے قدم
شاد ہوں گے کارناموں سے ترے شاہِ زمن

اور ایک شعر جس پر انھوں نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا یہ تھا ؎

تیرے جوہر ماند کر دیتے ہیں اوروں کی ضیاء
ہوں جواہر لعل، موتی یا کہ دُرِ بے بہا

آخر میں انھوں نے اپنے وفادار خادم سید حسین کو آواز دی کہ یہ فریم میرے اس اٹیچی کیس میں حفاظت سے رکھ دینا جو میں کراچی کے سفر میں ساتھ رکھوں گا۔ قائدِ اعظم جب مجھ سے دریافت کریں گے کہ میرے لیے دکن سے کیا تحفہ لائے ہو تو میں بڑے فخر سے اوج صاحب کی نظم پیش کروں گا نواب صاحب نے اپنی بدگمانی کی تلافی کے طور پر نظم کی اتنی تعریف کی کہ حاضرینِ محفل میں سے اکثر حضرات اس نظم کی ایک ایک نقل کی فرمائش کرنے لگے۔ اس وقت مجھ پر یہ کیفیت طاری ہونے لگی اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں میں نے الہ آباد میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سنی ہے۔ ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے سے پیشتر ان کے والدین کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے جنھوں نے ان کی کنیت ابوالکلام رکھی تھی۔ میں نے علی گڑھ کے رامپور حامد حال میں مسز سروجنی نائیڈو کو بھی سنا ہے اور انھیں سن کر ہی اس کا قائل ہوا کہ انھیں بلبلِ ہند کیوں کہا جاتا ہے۔ میں نے شاستری اور سر رادھا کرشنن کی تقاریر بھی سنیں

اور اس حقیقت کے باوصف کہ ان کا لب و لہجہ مدراسی تھا اس کا معترف ہونا پڑا کہ یہ حضرات سوڈنگ آف انڈیا کہلانے کے مستحق ہیں میں نے جامعہ اسلامیہ علی گڑھ میں ہمارے ملک کے آتش نوا مقرر مولانا ظفر علی خاں مرحوم آتش بیاں خطیب عطاء اللہ شاہ بخاری، پنڈت نہرو، بھولا بھائی دیسائی ہز ہائنس آغا خاں مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم اور دکن میں قائداعظم اور گاندھی جی کو بھی بولتے ہوئے سنا اور ان کی تقاریر کی خوشگوار یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں — "لیکن بہادر خاں"

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کی تصویر تھے۔ ان میں بہ یک وقت مولانا آزاد کا زور بیان، ظفر علی خاں کی آتش نوائی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی بذلہ سنجی، سروجنی نائیڈو کی طلاقت قائداعظم کی منطق، استدلال اور جامعیت اور شاستری اور سرراد ھاکرشنن کی روانی جمع تھی۔

وہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو لاکھوں کا مجمع جو ان کی تقریر کے انتظار میں رات بھر جاگتا ہوتا سنبھل کر بیٹھ جاتا۔ تقریر کے دوران ایسا سکوت طاری ہوتا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی وہ تقریر کرتے اور مسلسل کئی کئی گھنٹے تقریر کرتے لیکن جب ان کی تقریر ختم ہوتی تو سامعین کو یہ محسوس ہوتا جیسے ابوالہول نے اپنا سکوت توڑ دیا ہے۔ تقریر کی خوبی یہ ہے کہ جو الفاظ جو تشبیہ اور جو استعارہ ایک بار استعمال ہوتا اس کی تکرار نہ ہوتی۔ ہر ہر لفظ اپنی جگہ نپا تلا اور موزوں جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہے۔ وہ تقریر کیا کرتے تھے سامعین پر سحر کرتے تھے۔ اس لحاظ سے لوگ انھیں

جادو بیاں خطیب کہتے تو غلط نہ کہتے۔ ہندوستان میں جس جگہ بھی تقریر کرتے ان کا منفتوح علاقہ بن جاتا کیوں کہ ان کی تقریر سننے کے بعد سامعین کو کسی اور مقرر کی تقریر نہ بھاتی اور اس کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ انھیں سنے اور انھیں کو سنتا رہے۔ ان کی تقریر لاکھوں مسلمانوں کی آواز ہوتی اور غالب کے اس شعر کی تفسیر ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہی وجہ تھی کہ وہ "لسان الامت" کہلاتے تھے۔ ایک بار حیدرآباد دکن میں شرپسند ہندوؤں کے ایک محلہ لود حے واڑی میں کچھ لوگوں نے دو نوجوان پٹھان لڑکوں کو جن سے بہادر یار جنگ کی دور کی رشتہ داری تھی دھوکہ سے قتل کر دیا۔ جب یہ خبر حیدرآباد کے پٹھانوں تک پہنچی تو ان کی آتش انتقام بھڑک اٹھی۔ ہزاروں پٹھان اپنے قدیم آتشیں اسلحہ سے لیس ہو کر جلوس کی صورت میں نکل پڑے۔ حیدرآباد کے لیے یہ ایک بہت نازک لمحہ تھا۔ اس سے پہلے کبھی بھی حیدرآباد میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا۔ ہندو ہراساں ہو گئے۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔ خیال یہ تھا کہ اس روز حیدرآباد خون میں نہا جائے گا۔ حکومت دم بخود تھی، حکام پریشان تھے کسی میں ہمت نہ تھی جو غریب جوشیلے اور پُرغضب پٹھانوں کو روک سکتا۔ نظام دکن سے درخواست کی گئی کہ صرف بہادر خاں ہی اس پر جوش مجمع کو ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ نظام نے بہادر خاں سے درخواست کی اور بہادر خاں نے اس مجمع کو آدھے راستے جا لیا، اور پھر انھیں مخاطب کرتے ہوئے دو

گھنٹے تقریر کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں پٹھانوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ الٹے پاؤں گھروں کو لوٹ گئے۔ یہ بات معجزہ سے کم نہ تھی۔ یہ سحر خطابت تھا جو کام فوج اور پولیس کے دستے نہ کر سکتے تھے۔ بہادر خاں کی جادو بیانی نے کر دیا تھا۔ حکومت حیدر آباد ان کی ممنون احسان تھی مگر اس ممنونیت کا اظہار اور اس کا صلہ انھیں عجیب صورت میں دیا گیا یعنی نظام کو یہ تاثر دیا کہ جو شخص اپنی تقریر کے سحر سے پر جوش پر غضب اور مجسم آتش مجمع کو مسخر کر سکتا ہے وہ کسی وقت بھی ان کی آتش انتقام کو بھڑکا سکتا ہے۔ اگر یہ آگ قصر حکومت کا رخ کرے تو اسے جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔ نتیجہ بہادر خاں کی زباں بندی کی صورت میں نکلا۔

زباں بندی کے دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک ریلوے جنکشن پر جب مقامی لوگوں کو پتہ چلا کہ بہادر خاں گزر رہے ہیں تو ہجوم نے انھیں گھیر لیا، اور انھیں مجبور کیا کہ انھیں خطاب کریں۔ مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد بہادر خاں نے مجمع سے کہا کہ حضرات میری زباں بندی ہے لیکن اگر مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہوتی تو میں یہ کہتا۔ اس طرح ایک گھنٹہ تک خطاب کرتے رہے۔ اس دوران میں وہ وقفے سے یہ عذر کرتے رہے کہ ان کی زبان بندی ہے۔

ریاست حیدر آباد میں جن دنوں سر اکبر حیدری مرحوم صدر اعظم یا وزیر اعظم تھے ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی سورش کے پیش نظر ان کے مشورے سے حکومت نے دستوری اصلاحات کا اعلان کیا تھا۔

مجلس اتحاد المسلمین کی طرف سے ان دستوری اصلاحات کی وضاحت

کے لیے مجلس کے خرید کردہ گراؤنڈ دارالسلام میں کئی دن تک عام جلسے ہوتے رہے جس میں نواب صاحب مسلمانوں کو ان اصلاحات کے مضمرات سمجھاتے رہے۔ ایک تقریر میں انھوں نے بذلہ سنجی کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ مجھے ابھی تک نہیں بھولا۔ دوران تقریر سر اکبر کا ذکر آگیا اور نواب صاحب نے ان سے دستوری اصلاحات کے سلسلہ میں اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب سر اکبر نے فلاں تجویز پیش کی تو طبیعت چاہی کہ جھک کر چار . . . . اور یہاں تک کہہ کر نواب صاحب رک گئے۔

حیدرآبادیوں کا یہ وقفہ بڑا معنی خیز تھا اور ناتمام فقرہ کا عجیب سا تکملہ سب کے ذہنوں میں تھا۔ اب دم سادھے اس جملہ کی تکمیل کا منتظر تھا اس پس منظر میں کہ سر اکبر مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کے حامی تھے یہ ناتمام فقرہ اور لطف دے رہا تھا کہ نواب صاحب نے یہ جملہ مکمل کیا کہ . . . . طبیعت چاہی کہ جھک کر چار سلام بجالاؤں، اور اس کے ساتھ ہی مجمع زعفران زار بن گیا۔

سحر خطابت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات کسی جلسہ عام میں نواب صاحب تقریر کر رہے تھے کہ بارش شروع ہو جاتی۔ مجمع میں تھوڑی سی ہلچل مچتی تو نواب صاحب کی گرجدار آواز سنائی دیتی۔ "باران رحمت ہے کوئی مسلمان اپنی جگہ سے نہ ہلے . . . ." اس کے بعد لوگ شرابور ہو جاتے مگر کسی شخص کو اپنی جگہ سے اٹھنے کی ہمت نہ ہوتی۔

جن لوگوں نے لاہور میں ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے قرارداد پاکستان والے اجلاس میں جب کہ خاکساروں کا ایجی ٹیشن نقطہ عروج کو پہنچا تھا

بہادر خاں کی تقریر سنی ہے وہ ان کے سحر خطابت کی تائید کریں گے۔ اس تقریر کے بارے میں جوان کی معرکتہ الآرا تقریر تھی نواب صاحب نے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے قطعاً تیار نہ تھے نہ ان کے وہم و گمان میں تھا کہ ایسی کوئی تقریر کرنی پڑے گی۔ مسلم لیگ پنڈال میں خاکساروں پر گولی چلنے سے تازہ واقعہ کے پیش نظر بے چینی کے آثار ہویدا تھے۔ اتنے میں قائد اعظم نے اعلان کیا کہ اب نواب صاحب کی تقریر کے بعد کسی کا مخاطب کرنا بد ذوقی ہوگی اور انھوں نے بھی کوئی تقریر نہیں کی۔

ان کے اسی سحر خطابت کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ جس کی توثیق نہ ہو سکی شہرت پا گیا تھا۔

کہتے ہیں گاندھی جی نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جس وقت یہ ساحر واردھا کی کٹیا میں پہنچے تو انھوں نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ مہاتما کے جو پرستار آتے ہیں وہ ان کے چرن چھو کر کچھ بھینٹ ان کے چرنوں پر رکھ کر چلے جاتے ہیں۔ گاندھی جی نواب صاحب سے یہ کہہ رہے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ تم مولانا صاحب سے بھی اچھی تقریر کرتے ہو۔ اسی وقت کسی نے کشمیری سیب گاندھی جی کی بھینٹ چڑھائے گاندھی جی نے اس میں سے ایک سیب نواب صاحب کو تحفۃً دینا چاہا تو انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ تحفہ لینے کے لیے آگے بڑھا دیے۔ گاندھی جی نے کہا کہ جی چاہتا ہے تمھیں ایک ہی سیب دوں مگر تمھاری کشادہ ہتھیلیاں دیکھ کر دونوں ہی سیب بھینٹ کرتا ہوں۔

یہ سن کر نواب صاحب نے کہا کہ اب جب کہ آپ نے دونوں سیب

مجھے دے دیئے ہیں جی نہیں چاہتا کہ میں اکیلے اس کا مالک بنوں۔ انہوں نے کہا آپ یہ دونوں تقسیم کر لیں اور یہ کہہ کر ایک سیب گاندھی جی کے سامنے رکھا۔

تقسیم ہند کی مسلم لیگ کی پالیسی اور برصغیر میں پُرامن باہم وجودیت کی طرف اس لطیف اشارہ اور رمز سے سنتے ہیں کہ گاندھی جی بھی محظوظ ہوئے۔

نواب صاحب علامہ اقبال اور قائداعظم کے بڑے مداحوں میں تھے جمعہ کی شام نماز مغرب کے بعد ان کی کوٹھی بیت الامت میں ایک مجلس اقبال برپا ہوتی جس میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور ایسی پائے کے ایسے لوگ جمع ہوتے جو علامہ اقبال کے کلام کو سننے اور ان کے فن کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ ان میں سے بعض مجالس میں مجھے بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے بعض اشعار کے مطلب کو اس شرح و بسط سے ظاہر کرتے کہ حاضرین وجد میں آجاتے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے اس شعر کا مطلب ان پر عالم الغیب سے نازل ہوا ہے۔ قائداعظم پر وہ پروانہ وار فدا تھے۔ جب کبھی قائداعظم کا ذکر آتا تو وہ تقاریر میں کامل احترام سے تذکرہ کرتے کہ حیدرآباد کے تمام مسلمان قائداعظم کو دیکھے بغیر ان کے گرویدہ ہو گئے تھے اور جب کبھی قائداعظم نے حیدرآباد کا سفر کیا تھا ان کا وہاں اس قدر شاندار استقبال ہوا کہ کسی شہنشاہ کو بھی ایسا شاہانہ استقبال نصیب نہ ہوا ہوگا۔ میں نے قائداعظم کے حضور اس طرح دست بستہ دیکھا ہے جیسے کوئی جاں نثار خادم اپنے آقا کے حضور کھڑا ہو، اور قائداعظم کو بھی ان سے اتنی محبت تھی کہ وہ انہیں

اپنا دست راست سمجھتے تھے مگر انہوں نے نواب صاحب کو مجبور کیا تھا کہ حیدرآباد چھوڑ کر پنجاب میں آکر بسیں اور شمال مغربی ہند میں مسلم لیگ کے استحکام کے لیے کوشاں ہوں۔ نواب مرحوم شاید اس حکم کی تعمیل کرتے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ حیدرآباد میں جب نواب صاحب کو یہ خبر ملی کہ قائداعظم پر کسی خاکسار نے حملہ کر دیا ہے تو جن لوگوں نے نواب صاحب کی کیفیت دیکھی ہے وہ اس کی شہادت دیں گے کہ نواب صاحب اس طرح مضطرب و بے قرار تھے جیسے یہ حملہ خود ان پر ہوا ہے۔

وہ بار بار بارگاہ رب العزت میں دعا کرتے تھے کہ خدایا میری جتنی عمر باقی ہے وہ قائداعظم کی عمر کے حساب میں اضافہ کر دے۔ پر نہ تھے کہ وہ اڑ کر بمبئی پہنچے۔ بہرحال وہ پہلی ٹرین سے بمبئی پہنچے اور واپسی پر انہوں نے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے حملہ کی تفصیلات بتائیں اور قائداعظم کی درازی عمر کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگی۔

نواب صاحب کچھ عرصہ خاکسار تحریک سے بھی وابستہ رہے اور اس تحریک کے ڈسپلن کے اتنے پابند تھے کہ ایک بار انھیں مجلس کے ایک اجلاس سے خطاب کرنا تھا مگر خاکسار تحریک کے کسی جلسہ میں ٹرین کی تاخیر کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچے کی سزا میں انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجلس کے جلسے میں وہ اس حالت میں پہنچے کہ ان کے دونوں جانب دو خاکسار سپاہی انھیں گرفتار کیے ہوئے تھے۔ لوگوں نے اپنے محبوب قائد کو اس حالت میں دیکھا مگر وہ اس تحریک کے ڈسپلن سے واقف تھے اس لیے پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ اسی طرح ایک خاکسار کی جانب سے انھیں یہ سزا دی گئی کہ

وہ حیدرآباد کی سب سے بارونق سڑک افضل گنج کے پل پر دوڑ لگائیں لوگوں نے بڑی حسرت سے دیکھا کہ یہ نوجوان جاگیردار جس کی پرورش بڑے نازونعم سے ہوئی تھی یہ سزا ہنسی خوشی برداشت کر رہا ہے۔

بہت کم لوگوں کو شاید اس کا علم ہو کہ نواب صاحب اسلام کے بڑے مبلغ تھے اور ان کی کوششوں سے ہزاروں غیر مسلم اسلام کی آغوش میں آئے۔ ان میں سے اکثر نے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان ہو جانے کے بعد ان کی برادری کے مقاطعے کے سبب وہ روزگار سے محروم کر دیئے گئے ہیں تو نواب صاحب نے ایسے تمام افراد کے لیے اپنی گرہ سے روزگار کا انتظام کیا تھا۔ عقیدۃً وہ مہدوی تھے مگر کبھی کسی کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برخلاف اتحاد بین الاسلام کی انھوں نے حیدرآباد میں ایک عجیب و بے نظیر مثال قائم کی تھی یعنی مجلس اتحاد المسلمین کی عاملہ میں تقریباً تمام عقائد کے مسلمان شامل تھے اور نواب صاحب کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ سب مسلمان اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑے ہوئے تھے۔ ان کی قیادت کا سحر یہ تھا کہ خود ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ نواب صاحب ان کی قیادت کا فرض انجام دیں لیکن انھوں نے یہ جواب دیا کہ ہندو قوم مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ منظم اور بیدار ہے اس لیے وہ پہلے مسلمان قوم کو منظم کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد جب موزوں وقت آئے گا تو وہ یہ ذمہ داری بھی قبول کریں گے۔

نواب صاحب اولادِ نرینہ سے محروم تھے لیکن انھوں نے غریب طبقے کے بہت سے بچوں کو اپنی گود لے لیا تھا۔ ناشتہ کی میز پر ایک عجیب منظر دکھائی دیتا۔ پندرہ بیس گورے کالے بچے کرسیوں پر بیٹھے ہیں، اور نواب صاحب بڑی

شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے ہوئے باشندہ کر رہے ہیں۔ یہ بچّے ان سے اس قدر مانوس تھے ان کو اپنا مشفق باپ تصور کرتے تھے۔ نواب صاحب کی کوٹھی کے قریب ایک خوبصورت مسجد تھی۔ نماز فجر کے بعد وہ تفسیر کا سبق دیتے۔ ان کا مسلمانوں کو مشورہ تھا کہ قرآن کی تلاوت کرو تو سمجھ کر پڑھو جیسے قرآن براہِ راست ان پر نازل ہوا ہے۔ اس کے بعد ایسے دل نشین انداز میں تفسیر کرتے، جو شخص ایک بار اس درس میں شرکت کر لیتا ناممکن تھا کہ وہ کوئی اور درس ناغہ کرتا۔

نواب صاحب کی زندگی جتنی عظیم الشان تھی ان کی موت بھی اتنی ہی قابلِ رشک تھی۔ ان کی موت بڑی غیر متوقع تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس نے سنا یقین کرنے سے انکار کر دیا مجھے یاد ہے کہ جب میرے ایک بھانجے نے علی الصبح نیند سے بیدار ہو کر مجھے یہ خبر سنائی تو میں نے اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا کیوں کہ اس رات میں نے انھیں دعوت میں جاتے ہوئے خدا حافظ کہا تھا اور انھیں ہشاش بشاش، صحت مند اور چاق وچوبند چھوڑ کر آیا تھا۔ جب اس خبر کی تصدیق کے لیے میں سڑک پر نکلا تو ایک عجیب منظر تھا۔ راستے میں جس نے یہ خبر سنی وہیں بیٹھ کر رونے لگا۔ بلا مبالغہ ہر گھر میں کہرام مچا ہوا تھا اور ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے ان کا کوئی عزیز مشفق سرپرست اللہ کا پیارا ہوا۔ ان کے جنازے کے ساتھ جتنا مجمع تھا حیدرآباد کی تاریخ میں اتنا عظیم اجتماع نہیں ہوا تھا۔ ان کی موت گویا دکن کی آزادی کی موت تھی، حیدرآباد کے مسلمانوں کی موت تھی۔

آنے والے واقعات کی پرچھائیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور ہوا بھی یہی کہ ان کے بعد اس پائے کا کوئی لیڈر پیدا نہ ہو سکا، اور ان کے

جامِ شہادت نوش کرنے کے بعد حیدرآباد کا شمار بھی مرحومین میں ہوگیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا الیہ راجعون۔

قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی فرد

از۔ سلطان احمد

بہادر یار جنگ میری نظر میں

مت سہل ہمیں جانو۔ پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

دکن کی سرزمین ہمیشہ نازاں رہے گی کہ اس نے ایک بہادر کو پیش کیا، وہ انسان پیدا کیا جس نے اپنی مختصر زندگی کے باوجود برصغیر ہند و پاکستان کے ہر حصے میں اپنے لیے مقام پیدا کیا اور بیداری کی روح پھونکی جس کے باعث مسلمان نڈر ہوے اور بالآخر آزادی کی جدوجہد میں کامیاب و کامران رہے۔ وہ انسان آج ہم میں نہیں، وہ مردِ مومن ہم میں نہیں لیکن اس کی باتیں یاد رہیں گی اور ہر مرحلے پر یاد آتی رہیں گی۔

غالباً ۱۹۲۸ء کی بات ہے کہ صبح دکن میں کچھ مضامین کا سلسلہ میں نے شروع کیا تھا۔ نئی نئی امنگ تھی یونیورسٹی کی فضا میں پہنچے ہی تھے

ہونے کے باوجود دنیا کے بڑے بڑے صحافی سے زیادہ اس فن پر عبور رکھتے تھے۔ اس بات کا احساس مجھے اس پہلی ملاقات میں ہوا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں نے میرے اس خیال کی توثیق کردی۔ کوئی گھنٹہ بھر کی ملاقات رہی جس میں میں نے اور رضی صاحب نے بہت کم بات کی اور زیادہ تر بہادر خاں ہی بولتے رہے۔ اس مضمون میں نے اپنے جوش میں گاندھی جی کے لیے بعض ناموزوں باتیں لکھ دی تھیں اور اکثر جگہ صرف گاندھی، ہندو لیڈر اور اسی قسم کی طنز آمیز باتیں لکھی تھیں۔ مسٹر کا لفظ بھی نہ استعمال کیا تھا۔ بلکہ ایک جگہ جہاں طمع لکھ کر طمع کا لفظ استعمال کرنے کی وضاحت بھی کی تھی۔ بہادر خاں نے زیادہ تر اسی مضمون پر بات کی، صحافت کے اصول سمجھائے اخلاق کو ہاتھ سے جانے نہ دینے پر زور دیا۔ دشمن کے ساتھ اچھے برتاؤ کی نبی کریم ؐ کے اسوۂ حسنہ سے مثالیں دیں اور انتہائی شفقت اور محبت سے وہ باتیں دل نشیں کرائیں کہ جس کے باعث دل آزاری تو کجا شاید دل شکنی بھی ممکن نہ ہو سکے۔ عمر رفتہ کو آواز دے رہا ہوں تو خیال آتا ہے کہ کاش اس وقت اتنا ہوش ہوتا کہ یہ باتیں نوٹ کر لیتا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سحر زدہ ہوں ایک معمول کی طرح بیٹھا باتیں سن رہا ہوں۔ اگر وہ باتیں میں نے نوٹ کر لی ہوتیں، تو وہ مضمون صحافیوں کے لیے ایک صحیفۂ اخلاق کی حیثیت رکھتا۔ اس ملاقات کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا اور مجھے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب ہوتا کہ ان کی نظر کن کن مسائل پر ہوتی۔ حد یہ کہ یورپ کی سیاست پر بھی کوئی مضمون لکھا گیا ہے۔ ہٹلر، موسولینی پر کوئی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ انھوں نے اس کو بھی نہ چھوڑا، اور جہاں کوئی تعریف یا ترمیم کے قابل بات دیکھی ضرور اس طرف

متوجہ کیا۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ انھیں اپنی بے پناہ معروفیات کے باوجود اس قسم کے نوآموز لوگوں کے تحریر کیے مضامین پڑھنے کا کیسے موقع ملتا تھا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ اور بڑھ گیا۔ اور ان ہی ملاقاتوں کا فیض تھا کہ صحافت سے دلچسپی پیدا ہوی اور اب بھی باقی ہے۔ اس زمانہ میں دکن میں اردو کے روزنامے تو تھے لیکن کوئی انگریزی روزنامہ نہ تھا۔ دکن نیوز خبر رساں ایجنسی مقامی خبروں کے اکٹھا کرنے اور اخباروں کو مہیا کرنے کا کام اپنی حیثیت کے مطابق انجام دیتی تھی۔ سکندرآباد سے ایک ہفتہ وار انگریزی 'حیدرآباد بلیٹین' نکلتا تھا جو بعد میں روزنامہ ہوا لیکن یہ ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ اس طرح نیوز ایجنسی بھی کوئی ایسی نہ تھی جو مسلمانوں کے مفاد کا خیال رکھے۔ رائٹر ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا کا آفس تو تھا لیکن وہ زیادہ تر اس مقصد سے کام کرتا تھا کہ باہر کی خبریں اخباروں کو فراہم کرے۔ حیدرآباد کی نیوز شاذونادر ہی باہر جاتی اور وہ بھی اس ایجنسی کے انگریز یا ہندو آفیسروں کے ہاتھوں پامال ہوتی۔

ان تمام باتوں پر بہادر خاں کی نظر تھی۔ مجھے آپ معاف فرمائیں گے میں صرف بہادر خاں کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ یہ ایک وعدہ ہے جو نبھا رہا ہوں۔ ایک مرتبہ غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ بڑے چھوٹے سب ہی جمع ہو گئے اور ہر ایک نے انتہائی عقیدت مندی کے ساتھ ان کی تصویر آٹوگراف کے لیے پیش کی۔ میں برابر کھڑا ہوا تھا۔ ابھی وہ زور نہ آیا تھا کہ وہ بہادر یار جنگ سے صرف بہادر خاں ہوے تھے بلکہ اس کا تصور بھی نہ تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے محمد بہادر خاں کے نام سے دستخط کیے اور تاریخ

ڈال کر بچے کے حوالے کر دی۔ میں نے توجہ دلائی تو کہنے لگے۔ ایام جاہلیت کی یادگار، آئندہ سے انہیں اس نام سے یاد کرنا۔

خیر یہ بھی ایک پہلو تھا۔ اس تصویر کا میں عرض کر رہا تھا کہ بہادر خاں کی نظر تمام مسائل پر تھی، اور اکثر اس خواہش کا اظہار فرماتے کہ انگریزی صحافت نیوز ایجنسی کے کام میں بھی مسلمان نوجوانوں کو ٹریننگ حاصل کرنی چاہیے چنانچہ ان کی مختصر زندگی ہی میں اس کے کچھ مواقع انھوں نے فراہم کیے اور کچھ ادھر ذریعوں سے مجھے حاصل ہوئے اور ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کا ان کی زندگی ہی میں موقع مل گیا۔ حیدر آباد کے ایک سابق وزیر پٹنہ کے سید عبدالعزیز صاحب کے بھانجے سید محمود صاحب بیرسٹر کو ہموار کر کے اورینٹ پریس آف انڈیا کی داغ بیل ڈالی۔ خود بہادر خاں اس کے ڈائرکٹر تھے۔ اور حیدر آباد کا دفتر تقریباً ہیڈ آفس کی حیثیت ہی رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی صحافتی اصول نہیں توڑے اور اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اپنی پبلسٹی نہیں کروائی بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہم اپنی عقیدت مندی سے کچھ کر بیٹھتے تو ہمیں وہ بعد میں سمجھاتے کہ مخالفین کے نقطۂ نظر کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ دکن کا ہندو پریس یا بیرونی ملک کے اخباروں کے نمائندے اپنی مخالفانہ روش سے باز نہ آتے تھے۔ لیکن پریس کانفرنس، انٹرویو یا پبلک جلسوں میں کبھی ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک روا نہ رکھا۔ وہ آزادیٔ صحافت کے اتنے قائل تھے کہ خندہ پیشانی کے ساتھ ہر ٹیڑھے مخالفانہ بلکہ بعض صورتوں میں معاندانہ سوالات اور تنقیدوں کا، کچھ اس شگفتہ پیرائے میں جواب دیتے کہ بعض اوقات مخالفین کو بھی بعد میں ستائش

کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے۔

مدراس کے روزنامہ "ہندو" کے ایک نمائندہ تھے مسٹر نائیڈو کٹر قسم کے مہاسبھائی وہ کبھی شرارت سے باز نہ آتے اکثر اوقات اتحاد المسلمین اور اس کے کارکنوں کے بارے میں من گھڑت افسانے تیار کر کے اپنے اخبار کے لیے بھیجتے اور یہ باتیں پریس میں جگہ پاجاتیں۔ لیکن نواب صاحب کے تیور کبھی نہ بدلے اور نہ انھوں نے کبھی اس کا گلہ کیا۔ بلکہ بعض اوقات انتہائی شگفتگی کے ساتھ پوچھ بیٹھتے "WELL MR NAIDOU WHAT NEXT."

اسی نائیڈو کو اکثر میں نے خوش اخلاقی کی تعریف کرتے سنا۔ اور سانحہ ارتحال پر اس کی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔ اس عاشقِ رسول اللہ نے اسوۂ حسنہ کی مکمل پیروی کا نمونہ پیش کیا اور با دشمنان تلطف کا مجسم نمونہ تھے۔ اسی طرح ٹائمز آف انڈیا کا نامہ نگار لاٹوش اور حیدرآباد بلیٹن کے نمائندے چاری سے بھی وہ اسی مروت اور تلطف سے پیش آتے کہ وہ بھی کافی عرصہ تک یاد کر کے افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ اور ینیٹ پریس کے بارے میں میں نے عرض کیا ہے کہ بہادر خاں اس کے معمار تھے اور ابتدائی کارکنوں میں میں بھی شامل تھا۔ جس وقت خطاب واپس کرنے کا پہلی مرتبہ خیال پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا اظہار میرے سامنے پیش کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اسے ایک FEELER کے طور پر اورینٹ پریس اخباروں کو دے، کسی اور کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا کہ یہ اطلاع حاصل کی تھی۔

ان دنوں ینجنگ ڈائرکٹر سید محمد صاحب اتفاق سے حیدرآباد آئے تھے

تھے اور جب میں کامرانی کا تصور لیے پہنچا تو وہ وہیں موجود تھے اور چیف ایڈیٹر احمد انصار صاحب کے ساتھ کسی اہم مسئلہ پر بات کر رہے تھے میں انتظار نہ کر سکتا تھا اور میں نے انھیں یہ بات بتائی۔ سید محمد صاحب بے انتہا محتاط اور دور اندیش تھے وہ اس قسم کی خطرناک اطلاع کا سہرا اپنی نوزائیدہ ایجنسی کے سر باندھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سرکاری امداد کی جو بات چیت ہو رہی تھی اس میں کبھی رخنہ پڑنے کا اندیشہ تھا۔ وہ نہ ہوتے تو شاید میں کامیاب ہو جاتا لیکن انھوں نے بعض ارباب اقتدار سے مشورہ مناسب سمجھا اور یہی طے کیا گیا کہ نیوز نہ دی جائے۔ میں نے بہادر خاں سے وعدہ کر لیا تھا اس لیے اخلاقی فریضہ تھا میں نے اطلاع دی اور یہ بھی مشورہ دیا کہ سید محمد صاحب موجود ہیں وہ چاہیں تو بات کر لیں۔ نواب صاحب خود بھی ڈائرکٹر تھے اور صحیح معنوں میں روح رواں۔ لیکن انھوں نے یہ طریقہ کار اختیار نہ کیا بلکہ الٹے مجھے سمجھانے لگے کہ اس بات کا میں اتنا خیال نہ کروں اگر ممکن ہو سکے تو دوسرے صحافیوں کو دے دوں۔ چنانچہ میں نے دے دی۔ اور دوسرے ہی دن یہ اطلاع آگ کی طرح نہ صرف دکن کے گوشے گوشے میں بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی۔

اسی طرح ایک اور واقعہ پیش آیا جب کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف اپنی بعض مخالف لیگی مصروفیات کے باعث قائد اعظم کے مورد عتاب ہوئے۔ انہی زمانے میں ڈاکٹر لطیف کو ناگپور میں مسلم لیگ کی طلب کی ہوئی پاکستانی کانفرنس کا خطبہ صدارت پڑھنا تھا۔ قائد اعظم کی ناراضگی کا ناگپور والوں

میں لے کر واپس آجاؤں گا۔ اسی خیال سے کاتبوں کی تاکید کی تھی کہ میری واپسی کا انتظار کریں لیکن بیت الامت پہنچ کر پتہ چلا کہ مضمون قطعاً تیار نہیں۔ میری بے چینی دیکھ کر برابر میں بٹھالیا۔ اور کہا لکھیئے۔ پھر ایک امتحانی مبسوط اور جامع مضمون کوئی آدھے گھنٹے میں مجھے لکھوا دیا۔ درمیان میں شگفتہ بیانی بھی جاری رہی۔ لیکن کیا مجال کہ مضمون کی روانی یا تسلسل میں کوئی فرق آیا ہو۔ جیسے مضمون مکمل ہوا میں وہاں سے بعجلت ممکنہ واپس پہنچا۔ اس لیے کہ دوسرے دن ہی سالگرہ تھی۔ میں اپنی میز پر بھی نہ پہنچا تھا کہ ٹیلیفون آیا اور فرمانے لگے مجھے کچھ جملے بدلوانے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ اب شاید پورا مضمون مجھ سے پڑھنا ہوگا اور جب ان جملوں پر پہنچوں گا تو تصحیح ہوگی۔ لیکن مضمون سامنے ہونے کے باوجود ان جملوں کو ڈھونڈنے میں دقت ہو رہی تھی اور انہیں نہ صرف وہ جملے زبانی یاد تھے بلکہ ان کا محل وقوع بھی یاد تھا۔ عمر بھر اس بات کا ملال رہے گا کہ اس مضمون میں کتابت کی بعض غلطیوں کا انہیں گلہ رہا۔ عجلت میں پروف ریڈنگ ہو ہی نہ سکی وہ مانتے تھے کہ یہ مضمون حضور نظام کی نظر سے گزرے گا۔ اس کے بعد موت سے چند گھنٹے پہلے ملاقات میں انھوں نے گلہ کیا اور وہ دعوت میں جانے کی عجلت میں تھے۔ میں ٹھیک سے معذرت خواہ بھی نہ ہو سکا۔ کیسے علم تھا کہ آخری ملاقات ہوگی۔ آج طویل عرصے کے بعد یہ خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ نواب صاحب سے جدائی کے بعد خود لکھنے پڑھنے یا تقریر کرنے سے یا دوسروں کی تقریریں سننے میں دلچسپی باقی نہیں رہی۔ آخری خراج عقیدت میں نے سہاگ لٹنے کی کہانی بیگم بہادر خاں کی زبانی کی صورت میں "میزان" میں پیش کیا تھا ؎

یہ حال ہو گیا ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں اور میخانہ خالی ہے

سعید سبحانی (عثمانیہ)

بہادر یار جنگؒ

چمن زار ہند میں نہ معلوم "نرگس" کتنی طویل مدت تک اپنی بے نوری پہ روتی رہی تب کہیں جاکر اس کے جنوبی گوشۂ دکن میں بہادر خاں کے قالب میں ایک "دیدہ ور" پیدا ہوا جس نے دولت کی جھنکار میں آنکھیں کھولیں پھولوں کی سیج پر نازو نعم کے پورے لوازم کے ساتھ پرورش پائی۔ برادری اور کنبہ میں شہرت کی لہر دوڑ گئی کہ یہ "امیر ابن امیر" خاندانی امارت میں چار چاند لگا دے گا۔ اس کے حاشیہ نشینوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو عیش کوشی کی آبائی روایات کو حیاتِ تازہ نصیب ہوئی۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ کیا معلوم تھا کہ دارالامارت میں جنم لینے والا بچہ آئندہ چل کر خود امارت شکن ثابت ہوگا اور نصیب یاور جنگ کا محل جس میں صرف اولیائے نعمت ہی بار پا سکتے تھے ایک روز بیت الامت کے نام سے عوام کے لیے کھل جائے گا۔

تاریخ کے ہر عہد میں انسان تمول ہی کے پیمانے سے ناپا جاتا رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ نسلی اور نسبی تفاخر بھی اولادِ آدم کا طرۂ امتیاز رہا۔ قلمرو دکن میں نظام الملک آصف جاہ کی دولت ظفر علی خاں کے الفاظ میں ننگے سر پر ٹری پھرتی تھی۔ لیکن مستحق عوام کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ اگر بنظر ترحم

کسی کو بخت و اتفاق سے کچھ مل بھی گیا تو بہ قدر اشکِ بلبل امرائے پائیگاہ کی شان امارت تمام تجمل و شکوہ کی مظہر تھی لیکن وہ بھی عیش و نشاط کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ جاگیر دار خوش باش اپنے حال میں مست و مگن تھے۔ علمائے دین اور حامیانِ شرعِ متین کا قال ان کے محدود حلقہ سے باہر سنا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہادر خاں جو گفتار ہی کا نہیں کردار کا بھی غازی تھا۔ اپنی صلاحیت خداداد علمی اور عملی استعداد اور بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے تجربے سے لیس ہو کر امارت کے تفوق اور منصب و اعزاز کے وقار کو بالائے طاق رکھ کر اہلِ دل کی صفوں کو چیرتا ہوا نسل و خاندان کو روندتا ہوا انسان اور انسان کے مابین مصنوعی حد بندیوں کو توڑتا ہوا خدمتِ خلق کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔

ملتِ بیضا کو جس کا چہرہ زیبا تفرقہ اندازی کے داغوں سے مسخ ہو چکا تھا اپنی روح پرور خطابت سے چونکا دیا۔ جو کبھی سیل   بھی تھی اور کبھی جوئے نغمہ خواں بھی۔ ان کی تقریریں کتاب و سنت کے معارف، تاریخ اسلام کے حقائق اور ڈاکٹر اقبال کے رموز و نکات عبارت تھیں۔ خطابت کے سحر کے ساتھ جب ان عناصر کا امتزاج ہو جاتا ہے تو اہلِ ذوق اس کے تاثر کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جہاں کہیں بہادر خاں کی زبانِ فیض ترجمان گویا ہوئی وہاں کے باشندے بلا امتیاز فرقہ و ملت ان کے بندۂ بے دام ہو گئے اس میں شمال و جنوب مشرق و مغرب کی کوئی قید نہ تھی۔

غالباً ۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور آنجہانی حیدر آباد آئے۔ مسز سروجنی نائیڈو نے ان کے اعزاز میں اپنے مکان "گولڈن شولڈ"

میں ضیافت ترتیب دی اور نواب بہادر خاں سے اس موقعہ پر تقریر کرنے کی خواہش کی۔ نواب صاحب مسز سروجنی نائیڈو کا نہ صرف احترام کرتے تھے بلکہ ان کو ماں سے خطاب کرتے تھے۔ ان کی خواہش کے مطابق انھوں نے اس خصوصی تقریب میں تقریر فرمائی۔ ٹیگور آنجہانی اردو سے نابلد ہونے کے باوجود نواب صاحب کی خطابت سے بے حد متاثر ہوئے اور مشورہ دیا کہ وہ اس صلاحیت کو صرف اردو تک محدود نہ رکھیں بلکہ انگریزی میں بھی تقریر کیا کریں کیونکہ کسی ایک زبان کا کامیاب مقرر ہر زبان میں اسی مہارت اور کامیابی کے ساتھ تقریر کر سکتا ہے۔

مبداء فیاض نے بہادر خاں کے بھیس میں اہلِ ہند کو ایک بے نظیر خطیب، مقبول عام قائد اور بے مثال ترجمان قرآن عطا کیا تھا وہ "در کفے جام شریعت، در کفے سندانِ عشق" کا مصداق بن کر اٹھے۔ ملت اسلامیہ کی فرقہ بندی نے ان کے دل میں درد پیدا کیا۔ اور وہ اتحادِ ملت کا مشن لے کر میدانِ عمل میں آئے۔ ایک طرف تبلیغ اسلام کے فریضہ کی تکمیل میں بارہ ہزار بندگانِ خدا کو اپنے دست حق پرست پر حلقہ بگوشِ اسلام بنا کر ان کو مسلود فی النار سے نجات دلائی۔ دوسری طرف دکن کے خوابیدہ مسلمانوں میں شعور پیدا کرتے رہیں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ مجلس اتحاد المسلمین کا قیام ان ہی کی فکر و عمل کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے ہر فرقہ کے با اثر اور سمجھ دار افراد کو مشترکہ بنیادی عقائد کی اساس پر تعاون عمل کی دعوت دی۔ ان کے بے داغ کردار اور باکمال شخصیت کا اثر یہ ہوا کہ ایک مختصر سی مدت میں اتحاد المسلمین ایک وسیع اور مستحکم ادارہ بن گیا جس کی شاخیں ریاست کے

چپہ چپہ پر قائم ہوئیں۔ اقتضائے وقت کے مطابق مسلم عوام کے لیے جو سیاسی نصب العین تجویز کیا گیا اس کو انھوں نے اپنا یا اور اپنے ہر دلعزیز قائد کی آواز پر ہر وقت سینہ سپر ہونے کا عہد کیا۔ غرض اس صاحب بصیرت معمار قوم نے خلوص اور سعی پیہم کا مسالہ آمیز کر کے چشم زدن میں ایک بلند و بالا عمارت تعمیر کر ڈالی۔ یہ وہ زمانہ تھا ریاستی حکومت کی معینہ پالیسی کے خلاف ہر فرقہ کی جانب سے سیاسی مطالبات کی بوچھار شروع ہوئی۔ اتحاد المسلمین کی جانب سے بھی جس نے مسلمانوں کے سیاسی معاشرتی اور سماجی حقوق کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا تھا۔

دکن میں مسلمانوں کے خصوصی موقف کی بناء پر چند مطالبات پیش کیے گئے۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ مسلمانوں نے سرزمین دکن پر گذشتہ (۶۰۰) برس تک حکمران ہونے کے باوجود اپنے ہم وطنوں کی جان و مال کی حفاظت کا کام انجام دیا۔ اس فرض کی ادائیگی نے ان کو اپنے مالی اور اقتصادی مسائل کی گتھیاں سلجھانے کی بھی فرصت نہیں دی۔ اس لیے ریاستی نظم و نسق میں ان تجربہ نیز ذہنی اور روحانی صلاحیت کے لحاظ سے ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کسی فرقہ کو اس کی عددی کمتری کی بناء پر دوامًا اقلیت قرار دینا بھی دانش مندی نہیں ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کے مسلمہ اصول کی عمل آوری ذہنی اور دماغی صلاحیت رکھنے والے مختلف فرقوں کی سیاسی موت کے مترادف ہے۔ اقلیت اور اکثریت کی اصطلاح کا انطباق صرف ان ہی ممالک کی سیاسی جماعتوں پر ہوسکتا ہے یہاں کے باشندوں میں قومی مذہبی اور ثقافتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ایسے ہی ممالک میں سیاسی

پارٹیاں اپنے نصب العین اور پروگرام کے مطابق کبھی اکثریت اور کبھی اقلیت کے درجہ میں آجاتی ہیں. اس کے برخلاف ہندوستان جیسے ملک میں جو مختلف اقوام کا برصغیر ہے کسی قوم کی اس کی کثرت آبادی کے باوجود جو کروڑہا باشندوں پر مشتمل ہو، اقلیت قرار دینا بہت ہی سنگین سیاسی ظلم ہے. اسی صحت مند اصول کی بناء پر مجلس نے اپنی سیاسی جنگ جاری رکھی. حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت کے حصول کی خاطر تشدد کا آغاز ہوا. ستیہ گرہ عمل میں آئی، بم پھٹے اور فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے مگر مجلس نے آئینی جدوجہد کے دائرے سے قدم باہر نہیں نکالا. مجلس کے صدر نواب مرحوم نے حیدرآباد کے سیاسی مستقبل کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کو واضح کرنے کے لیے کل ہند کانگریس کے ممتاز قائدین سے ربط پیدا کیا. چنانچہ سب سے پہلے الہ آباد میں آپ نے ابوالکلام آزاد سے گفتگو کی. مولانا پر نواب صاحب کی صحتِ فکر کا اس درجہ اثر ہوا کہ انھوں نے نہ صرف پنڈت نہرو سے گفتگو کرنے کی رائے دی بلکہ ان سے ملاقات کرا دینے کی بھی ذمہ داری قبول کر لی. دوسرے دن جب پنڈت نہرو آنند بھون تشریف لائے تو مولانا ابوالکلام نے ان سے نواب صاحب کا تعارف کرایا اور یہ کہتے ہوئے کہ "نواب صاحب افصح منی لساناً" ہیں. پنڈت نہرو سے خواہش کی کہ وہ بھی نواب صاحب کی زبان سے تفصیلات سنیں. پنڈت جی نے بخوشی رضامندی ظاہر کی اور نواب صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ وہ ان کو صرف پندرہ منٹ دے سکتے ہیں کیونکہ مصروفیت کے باعث وہ اپنا وقت تول تول کر صرف کر رہے ہیں. نواب صاحب نے پنڈت جی کے سامنے اپنے مخصوص دلنشین انداز

میں حیدرآباد کی سیاسی صورت حال اور اس میں مسلمانوں کے موقف کو واضح کیا۔ اور ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد گھڑی دیکھ کر اپنی گفتگو ختم کر دی پنڈت جی نواب صاحب کے بیان سے اتنے متاثر ہوے کہ انھوں نے مزید گفتگو جاری رکھنے کی خواہش کی اور فرمایا کہ اس کو ختم کرنے کے لیے اور کتنا وقت درکار ہوگا؟ نواب صاحب نے خود پنڈت جی سے استفسار کیا کہ ان کی ترازو میں کتنے وقت کی گنجائش ہے۔ اس پر پنڈت جی مسکراتے ہوے مزید پندرہ منٹ دیے۔ گفتگو کے خاتمے پر پنڈت جی ہندی سیاسیات میں فرقہ وارانہ کانگریس ایت کر جانے پر افسوس کا اظہار کیا اور نواب صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ مقامی کانگریسی زعماء سے فیصلہ کن گفتگو کریں گے۔

بہرحال مجلس کی پالیسی چونکہ ہندوستان کے مسلمہ اصولِ جمہوریت کے مغائر تھی، حیدری حکومت نے مجلس کے صدر نواب مرحوم کے خلاف معاندانہ حربے استعمال کرنے شروع کیے۔ ان کی زبان بندی کی گئی۔ جاگیردار اور ناظم جمعیت کے عہدہ دار ہونے کی حیثیت سے چونکہ وہ معاش دار اور ملازم سرکار تھے اس لیے سیاست سے ان کے تعلق کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ تاکہ عوام ان کی قیادت سے محروم ہو جائیں، ان سے ربط و ضبط گھٹے اور مجلس کی مناسبت متاثر ہو جائے۔ اس طائر لاہوتی نے اپنی جاگیر، مناصب اور اعزاز کو حضور نظام کی خدمت میں لوٹا دیا تاکہ اس کی "پرواز" میں کوتاہی نہ آنے پائے۔ نواب صاحب نے حضور نظام کو مخاطب کر کے لکھا جاگیر اور مناصب واپس کر کے میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ خدا نے سارے اسباب اور وسائل سے نجات دلا کر مجھے اپنا بندۂ خاص بنا لیا ہے۔ ملت کی خاطر فائدہ ملت کا

یہ عظیم الشان ایثار اہل دول کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ چشم عوام نے ان کو اتنا مسرور اور مطمئن کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جتنا انھوں نے اپنی ساری متاع اور آبائی ذرائع معاش سے سبکدوش ہوکر محسوس کیا تھا۔ جاگیر کے استرداد کے ساتھ ہی ان کے مخلص دوست نواب میر اکبر علی خاں بیرسٹر نے اپنی جاگیر کی آمدنی سے ماہانہ ایک ہزار کی مستقل امداد کا پیش کش کیا۔ اور جس مہینہ میں جاگیر واپس کی گئی اسی ماہ کی بابت پوری رقم نواب صاحب نے پیش کش کو مسترد کر دیا۔ لیکن رقم مجلس کے فنڈ میں جمع کر کے رسید معطی کے نام اجرا کر دی۔ ریاستی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کے باوجود نواب صاحب کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ ان کی قیادت کا حلقۂ اثر وسیع تر ہوتا رہا۔ دکن کے ۔۔۔ ۸۵ ہزار مربع میل کا رقبہ ان کے عزم بلند کے مقابلہ میں بہت تنگ تھا۔ وہ کل ہند اسٹیٹ مسلم لیگ صدر منتخب ہوئے۔ جس کے اجلاس ہر سال کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر نواب صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ ہر سال قائد ملت ہی کی تقریر دل پذیر مسلم لیگ کے اجلاس کا خاتمہ ہوا کرتی تھی، اور وہ اجلاس ناکام متصور تھا جس میں یہ خطیب شعلہ نوا اپنی گفتار سے گرمیٔ محفل کا باعث نہ بنتا۔ نواب صاحب کی تقریر کی بدولت لیگ کے سرمایہ میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اجلاس لاہور، دہلی اور کراچی کی صد فیصد کامیابی نواب صاحب کی خطابت کا نتیجہ تھی۔ دہلی کے اجلاس کل ہند مسلم لیگ میں نواب صاحب کی تقریر اور جلسہ پر اس کے غیر معمولی تاثر کی خبر پاکر ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے نواب صاحب کے موسومہ مکتوب میں تحریر فرمایا تھا۔

"BUT FOR YOU, THE DELHI WOULD HAVE DEEN REDUCED TO ZERO."

برطانوی ہند اور ریاستی ہند میں نواب صاحب کی روز افزوں مقبولیت کے باعث حیدری حکومت لرزاں و ترساں تھی۔ اس کا منصوبہ تھا کہ نواب صاحب کو کچھ اس طرح پابند کیا جائے کہ ان کی مساعی بے نتیجہ ہوں اور ان کی قیادت کا اثر زائل ہو جائے چونکہ نواب صاحب کی شخصیت ہمہ گیر اہمیت کی حامل تھی اس لیے ریاستی حکومت کو یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے خلاف تشدد بہ تمام کل ہند احتجاج کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ اسٹیٹ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے مشورہ سے نواب صاحب کے خلاف موثر کارروائی کی جائے۔ ادھر حضور نظام کو ان کے خوشامدی درباریوں نے باور کروایا کہ نواب صاحب کی بے پناہ مقبولیت سے اس کے آثار پیدا ہو گئے ہیں کہ اٹلی کے مسولینی اور جرمنی کے ہٹلر کی طرح وہ دکن میں آمریت اختیار نہ کر لیں اس لیے مناسب یہی ہے کہ مرحلۂ اول ہی میں اندیشہ کا ازالہ کر دیا جائے۔ غرض سازش کی تکمیل کے بعد حکومت نے نواب صاحب کی ذات کو ریاست کے مستقبل کے لیے خطرہ سمجھ کر حکومت ہند کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کو مطلع کیا کہ وہ نواب صاحب کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس زمانے میں سر فرانسس وائلی حکومت ہند کے سیاسی مشیر کی حیثیت سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے انچارج تھے اور نواب صاحب کی قیادت کی روز افزوں مقبولیت سے بھی وہ آگاہ تھے انھوں نے اس مسئلہ میں عجلت کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اولاً بطور احتیاط لیگی حلقوں میں نواب صاحب کے اثر و رسوخ اور مجوزہ گرفتاری کے بعد اس کے رد عمل کے بارے میں دریافت کروائی گئی۔ لیگی قائدین نے نواب مرحوم کی قیادت کے تعلق سے مثبت قسم کی رائے ظاہر کرنے سے عمداً گریز کیا۔

بلکہ اپنی رپورٹ میں ان کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی۔ ان آراء کے بین السطور سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ پر نواب مرحوم کے خلاف لیگی قائدین کی رقابت واضح ہوگئی۔ اس پوری کارروائی کے بعد صحیح نتیجہ پر پہنچ کر اس نے ریاستی حکومت کو جواب ادا کر دیا کہ وہ نواب صاحب کو اپنی ذمہ داری پر گرفتار کر سکتی ہے ظاہر ہے کہ اس جواب سے اسٹیٹ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے معہود ذہنی کا پتہ چلتا تھا۔ اس لیے حیدری حکومت کو گرفتاری کی تجویز پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حکومت کی ان ساری کارروائیوں سے واقفیت کے باوجود قائد مرحوم نے اپنے مشن کی تکمیل میں پورے انہماک کے ساتھ معروف رہے۔ جب کبھی آپ کے ہمدردوں نے یہ مشورہ دیا کہ وہ حیدرآباد کا قیام ترک کر کے برطانوی ہند کے کسی شہر میں اقامت اختیار کریں۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ سپاہی اپنا محاذ نہیں چھوڑ سکتا۔ راستے کی مشکلات نے کبھی آپ کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کی۔ اگر ان کی عمر نے وفا کی ہوتی تو نہ معلوم آج صورت حال کیا ہوتی؟

یہ نواب کی سیاسی زندگی کی ایک جھلک تھی۔ ان کی حیات کا علمی اور معاشرتی پہلو بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھا۔ وہ زندگی بھر طالب علم رہے۔ وہ فرماتے تھے کہ دو چیزوں کو دیکھ کر رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ ایک اچھی کتاب اور دوسرے اچھا ہتیار۔ ان کی تشنگی علم کبھی فرو نہ ہوئی خصوصاً علم دین کا احیاء اور اس کا حصول ان کا مقصد زندگی تھا تفسیر، حدیث، سیرۃ، تاریخ اسلام اور اقبالیات تو ان کے خاص موضوع تھے۔ تفسیر کا درس نماز کے بعد اپنے محلہ کی مسجد میں خود دیا کرتے تھے جو ان کے وسیع اور عمیق مطالعہ کا نچوڑ ہوتا تھا۔ ایک عرصہ تک وہ جامعہ عثمانیہ کے طلباء کے سامنے جو ہر پنجشنبہ کی شام کو ان کی دیوڑھی

پر جمع ہوتے تھے۔ تاریخ اسلام پر مسلسل لکچر دیئے۔ ہر جمعہ کو درس اقبال کا حلقہ ہوتا جس میں ماہرین اقبالیات کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور اقبال کا کلام سبقاً سبقاً پڑھا جاتا۔ اس حلقہ کی افادیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اتحاد المسلمین کی محلہ واری شاخوں نے بھی اپنے اپنے حلقوں میں تفسیر اور درس اقبال کی صحبتیں منعقد کرنا شروع کر دی تھیں۔

قائدِ مرحوم بڑے زندہ دل اور شعر و ادب کا نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے خود شعر کہتے تھے اور ممتاز شعرا کا منتخب کلام ان کی نوکِ زبان تھا۔ اچھے شعر پر سر دُھنتے اور دنوں وہ ان پر طاری رہتا۔ زمانۂ قیادت کے اوائل میں اپنے مخصوص احباب اور بزرگوں کی خدمت میں عید کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ عید الضحیٰ کے موقعہ پر عید کارڈ کے لیے حضرت میر دردؔ کا حسب ذیل شعر منتخب کیا۔

میں ہوں گلچینِ گلستانِ خلیلؑ
آگ پر ہوں پر باغ باغ ہوں میں

عید کارڈ اوروں کے منجملہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سلیمان ندوی اور سر سلیمان کے پاس بھیجے گئے تھے۔ ان تینوں باکمال بزرگوں نے جواب میں نواب صاحب کے ادبی ذوق اور انتخاب شعر کی جو ان کے حسب حال تھا دل کھول کر داد دی۔ جگر مرادآبادی نواب صاحب کے پسندیدہ شاعر تھے۔ احباب کی محفلوں میں ان کا کلام ترنم سے گا کر پڑھتے تھے۔ طباعی اور غیر معمولی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ کلام سے معنی و مطالب کے وہ موتی نکالتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ چنانچہ جگر مرحوم

نے اپنے آخری مجموعہ کلام "آتشِ گل" کو قائدِ ملت کے نام سے معنون کرتے ہوئے لکھا ہے "میں اپنے اس مجموعہ کلام کو قائدِ ملت مولوی بہادر خاں مرحوم سابق نواب بہادر یار جنگ کے نام نامی سے منسوب کرنا اپنا اخلاقی اور ادبی فرض تصور کرتا ہوں جو سراپا گداز مجسمۂ اخلاق فقید المثال مقرر، کامیاب مصلح اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب اور جری انسان تھے۔ جن کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہ تھا وہ بیک وقت تمام محاسنِ شعری کا احاطہ کر لیتے تھے اور اچھے شعر سے اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا خوش مزاج انسان نہ دیکھا۔ صلۂ رحمی، بنی نوع انسان کی ہمدردی، حاجت مندوں کی امداد اور عفو و درگذر میں جہاں وہ پیش پیش تھے وہیں حق گوئی اور بے باکی ان کی خصوصیتِ خاصہ تھی۔ خلوت ہو یا جلوت، امراء کی محفلیں ہوں یا والیانِ ریاست کا دربار اعلانِ حق سے ان کی زبان جھجکتی نہ تھی۔ مصافِ زندگی میں وہ سپرِ فولاد کے حامل تھے تو شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں بن جاتے۔

قائدِ ملت برق و باد کی طرح اٹھے، ابرِ رحمت بن کر برسے اور پھولوں کی مہک بن کر رخصت ہو گئے۔ جنوبی ہند کے آسمانوں سے ایک ستارہ ٹوٹا اور کشورِ ہند کی تیرہ و تار فضاء کو روشن کر کے اچانک روپوش ہو گیا۔

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود!

ان کی فتح انسانیت کی فتح تھی۔ باطل کے خس و خاشاک کے لیے ایک سیلاب، ظلم کے ایوانوں کے لیے ایک زلزلہ، مظلوموں، بے کسوں

اور عدل و انصاف کے متلاشیوں کے لیے روشنی کا مینار تھے۔ ان کی زندگی، شاعرِ مشرق کے اس شعر کی مکمل تفسیر تھی ؎

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

شاہد رزاقی

قائدِ ملّت بہادر خاں

قائدِ ملّت بہادر خاں (سابق نواب بہادر یار جنگ) ۳ر فروری ۱۹۰۵ء کو نظام دکن کے ایک سربرآوردہ جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن یہی نظام اور ان کے جاگیردار دونوں بہادر خاں کے بدترین مخالف ثابت ہوئے اور اس مخالفت کا سبب یہ تھا کہ بہادر خاں حق پرست اور حق گو تھے۔ نظام جو ظل اللہ بنے ہوئے تھے بہادر خاں کے اس نظریہ کو برداشت نہ کر سکے کہ "میں عبدالملک نہیں عبداللہ ہوں۔ میرا ایمان یہ ہے کہ اسلام میں موروثی حکومت اور ملوکیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ حیدرآباد کے اصل حکمراں اس مملکت کے مسلمان ہیں، اور نظام کا تخت و تاج ملّت اسلامیہ کے سیاسی اقتدار کا مظہر ہے۔" اور امیروں اور جاگیرداروں نے بہادر خاں کے اس اظہارِ حقیقت کو اپنے مفاد کے منافی تصوّر کیا کہ "ملّت" کے کام آنے والی

دولت ہی موجب برکت ہوتی ہے. ابوبکرؓ و عثمانؓ کی دولت اللہ کی رحمت ہے لیکن قارون و شداد کی دولت ایک بدترین لعنت ہے. آنے والے خطرات سے آنکھیں بند کرنے والے امراء کی سلامتی کا راز اس حقیقت کے عملی احساس میں مضمر ہے کہ جب کوئی طوفان آتا ہے تو گھاس کے ننھے پودے اپنا سر جھکا دیتے ہیں اور جب تند و تیز سیلاب ان کے اوپر سے گذر جاتا ہے تو یہ پھر سر اٹھا لیتے ہیں لیکن بڑے بڑے تناور درختوں کو یہ سیلاب جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔"

مفاد پرستوں کی اس مخالفت نے خطرناک سازشوں کی شکل اختیار کرلی اور آخرکار اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہادر خاں نے ۲۵ / جون ۱۹۴۴ء کو صرف چالیس سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا.

بہادر خاں نے تقریباً پچیس سال کی عمر میں قومی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا. قومی زندگی کے آغاز ہی میں انھوں نے تمام اسلامی ممالک کا دورہ کر کے وہاں کے رہنماؤں سے ربط قائم کیے. واپسی کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور پست اقوام میں اسلام کی تبلیغ پر اپنی کوششیں مرتکز کر دیں.

معاشرتی اصلاح کے ساتھ ہی اسلامی تعلیمات کی تجدید کو بھی انھوں نے اپنا قومی نصب العین بنایا اور امیروں اور جاگیرداروں کو قومی فرائض پر متوجہ کرنے کے لیے ایک تنظیم قائم کی. تبلیغ اسلام میں انھوں نے دو اصولوں کو پیش نظر رکھا. ایک یہ کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر نہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ دیہاتوں میں چند افراد کو مسلمان کرنے کے بجائے پوری جماعت کو مسلمان

کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ان مسلموں کو مخالفین نقصان نہ پہنچا سکیں۔
بہادر خاں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے اور چار سال کے عرصہ میں ستائیس ہزار کافروں کو مسلمان کیا۔ تبلیغ مذہب کے علاوہ بہادر خاں نے نو مسلموں کی تعلیم اور روزگار کا بھی مستقل انتظام کیا تھا جو ان کے بعد بھی قائم رہا، اور حیدرآباد پر بھارت کا قبضہ ہونے کے بعد ختم کیا گیا۔

قائد ملت کی سرگرمیوں کا دائرہ روز بروز وسیع تر ہونے لگا۔ انھوں نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ دکن کے مسلمان دوسرے مسلمانوں سے بالکل علیحدہ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی مشترکہ ملی تنظیم کل ہند مسلم لیگ سے وابستہ ہو جائیں۔ ریاستی مسلمانوں کے راستہ میں سیاسی مصلحتیں حائل تھیں۔ اس لیے قائد ملت نے قائد اعظم کے مشورہ سے کل ہند ریاستی مسلم لیگ قائم کی اور اس طرح تمام ریاستوں کے مسلمان ایک تنظیم کی شکل میں مسلم لیگ سے مربوط ہو گئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ کے دوران قائد ملت، قائد اعظم سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ بہادر خاں نے قائد اعظم کی نظر میں وہ قدر و منزلت حاصل کر لی جو کسی اور کو نصیب نہ تھی اور بہادر خاں کو بھی اپنے قائد سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی اور وہ اپنے رہنما کی اطلاع اور مشورہ کے بغیر کوئی اہم قدم نہ اٹھاتے تھے۔ قائد اعظم بہادر خاں سے مسلم لیگ کی ترقی و استحکام اور اس کے مقاصد کی اشاعت کا کام لینے لگے۔ ہندوستان کے تمام صوبے بہادر خاں کی جولانگاہ بن گئے۔ مسلم لیگ کو جہاں مشکلات پیش آئیں ان پر قابو پانے کے لیے قائد اعظم بہادر خاں کا انتخاب فرماتے۔ ہندوستان کا شمال مغربی

خیالات میں نہ پختگی تھی نہ ٹھہراؤ، جو کچھ سمجھ میں آتا اسی کو حرف آخر سمجھ کر لکھو بیٹھتے اور شائع ہوتا تو خیال ہوتا کہ یہی سب کچھ ہے۔ اسی زمانہ میں کانگریس کی خلا بازیوں نے ذہن کو متنفر کیا اور مسلم لیگ اور قائد اعظم محمد علی جناح کے بارے میں مطالعہ کے نتیجے میں ایک مضمون گاندھی جی کی اہمسائی کی پالیسی کانگریس کی مسلمانوں کے سلسلہ میں بے راہ روی پر میں لکھا اور یہ دو یا تین قسطوں میں اخبار میں شائع ہوتا رہا۔ آج اس مضمون کو دیکھوں تو اس میں بہت سی خامیاں خود مجھے نظر آئیں گی لیکن اس زمانے میں بھلا یہ خیال کہاں ہو سکتا تھا کہ اس میں کوئی خامی بھی ہو سکتی ہے۔

اس مضمون کو شائع ہوئے دو ایک ہی دن ہوئے تھے کہ میرے ایک عزیز دوست ریاض احمد جنہیں بہادر خاں مرحوم سے بے حد عقیدت تھی اور بہت عرصے سے نواب صاحب کے پاس آتے جاتے تھے میرے ہاں آئے اور مجھے بتایا کہ نواب صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرے لیے یقیناً نئی بات تھی۔ میری افتادِ طبع کے باعث مجھے جاگیرداروں، نوابوں اور منصب داروں وغیرہ سے کچھ دور ہی بھلی معلوم ہوتی۔

اس سے پہلے بھی ریاض صاحب دو ایک مرتبہ مجھے اپنے طور پر ملاقات کرانے کی دعوت دی تھی۔ لیکن میں نے ٹال دیا۔ لیکن اس موقع پر میں انکار نہ کر سکا یہ پہلی ملاقات میری زندگی کا وہ موڑ ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں میری صحافتی زندگی اسی دن سے شروع ہوئی۔ لوگ بہادر خاں کو لسان الامت، قائد ملت، سیاستداں، خطیب اور محمد رسول اللہؐ کے شیدائی کی حیثیت میں یقیناً جانتے ہیں۔ لیکن شاید کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ وہ صحافی نہ

کو علم ہوا تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت اور پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع دیدی۔ غالباً یہ معاملات اس وقت طے پائے تھے جب قائد ملت بہادر خاں قائد اعظم سے ملاقات کرکے حیدرآباد واپس ہوتے ہوئے ناگپور ٹھہرے تھے۔ ڈاکٹر لطیف کو اس کا علم تھا۔ واپسی کے فوراً بعد ہی بلاقات میں نواب صاحب نے مجھے پس منظر سے آگاہ کردیا تھا۔ دوسرے دن اور سٹ پریس میں ڈاکٹر لطیف پہنچے اور انھوں نے وہ بیان دیا جس میں قائد اعظم کی روش کا اور بہادر خاں کے کردار پر بھی کچھ چھینٹے ڈالے تھے یہی وہ بیان تھا جس سے ڈاکٹر لطیف کے زوال کا آغاز ہوا۔ میں تمام حالات سے واقف تھا لیکن ڈاکٹر صاحب سے کہنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کی روانگی کے بعد میں نے نواب صاحب کو بیان پڑھ کر سنایا۔ میں اپنی دانست میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے SPURCESS کرانے کی کوشش کریں گے لیکن فراخدلی اور صحافتی آداب ملاحظہ فرمائیں کہ نواب صاحب نے مشورہ دیا کہ من وعن مقامی پریس کو بھی دیں اور باہر بھی ضرور بھیجیں۔

اس بحر بیکراں کے لیے تو سفینہ چاہیے۔ لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا صرف ایک دو باتیں اور سن لیں۔ نواب صاحب کے ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے سے صرف چند دن پہلے اعلیٰ حضرت نظام کی سالگرہ کے موقع پر اردو "میزان" نے ایک خاص نمبر شائع کیا۔ نواب صاحب سے مضمون حاصل کرنے کا کام میرے سپرد ہوا۔ لیکن نواب صاحب کو فرصت نہ ملتی تھی۔ آخری کاپی پریس کو جانے والی تھی کہ میں نے ایک آخری کوشش کی۔ حکم ہوا آجایئے۔ کشاں کشاں پہنچا محفل جمی ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ مضمون تیار ہوگا اور

سرحدی صوبہ مسلم لیگ کے مخالفین کا مرکز بن گیا تھا جہاں خان برادران، سرخ پوش اور دوسرے کانگریس پرست عناصر تحریک پاکستان کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اس صوبہ میں مسلم لیگ کو مستحکم بنانے کا کام پہلا اہم کام تھا جو قائداعظم نے بہادر خاں کے تفویض کیا اور انھوں نے یہ فرض بڑی خوبی سے انجام دیا۔ تحریک پاکستان کی ترقی کے بعد قائداعظم کی حقیقت شناس نظر نے ان صوبوں کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا جن پر اب مغربی پاکستان مشتمل ہے اور کانگریس کی سیہ کاریوں سے اس علاقے کو پاک کرنے کے لیے ان کی یہ تجویز تھی کہ بہادر خاں حیدرآباد کے بجائے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اس اہم علاقہ میں مسلم لیگ کو مستحکم بنائیں۔

بہادر خاں کی بے وقت موت کے باعث اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ ورنہ ممکن تھا کہ مسلم لیگ اور مسلمانوں کو ان مشکلات و مصائب کا سامنا ہوتا جو خان اللہ بخش خضر وزارتوں نے پیدا کر دیں۔

قائد ملت بہادر خاں کو قدرت نے سحر بیان مقرر بنایا تھا اور ان کا کمال خطابت مسلم لیگ کا سب سے بڑا اور موثر حربہ تھا۔ قائد ملت کی زبان قائداعظم کی سب سے بڑی ترجمان تھی۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے اختتام پر قائد ملت کی تقریر ان جلسوں کی ایسی ہی نمایاں خصوصیت بن گئی تھی جیسے کہ قائداعظم کا خطبہ۔ صدارت مسلم لیگ کے مخالف بڑی جد و جہد کے بعد جو تنظیمی قلعے بناتے تھے قائد ملت کی ایک تقریر ان کو منہدم کر ڈالتی تھی۔ مسلم لیگ سے قائد ملت کو بڑی محبت تھی اور وہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس کا پیغام پھیلاتے رہے۔ پاکستان بہادر خاں کی امیدوں کا مرکز

تھا. وہ پورے خلوص اور صدق دل کے ساتھ اس پر یقین رکھتے تھے اور اپنی تمام صلاحیتیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وقف کردی تھیں جب وہ پاکستان کی حمایت میں تقریر کرتے تھے تو کمال خطابت کے ساتھ ہی ان کے خلوص و صداقت اور ایقان و ایمان کی زندہ و بیدار قوتیں بھی ان کی تقریریں جلوہ گر ہوتی تھیں اور ان کے الفاظ ساری قوم کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتے تھے. بہادر خاں کے اسی جذبہ اور اس کی تاثیر نے پاکستان کو ایک مقدس نصب العین بنا دیا.

پاکستان کو پاک بنانے کے لیے بہادر خاں کا یہ نظریہ تھا کہ پہلے تو ذہنی انقلاب کی منزل طے کی جائے اور پھر اسلامی نظام حیات کا نفاذ ہو ذہنی انقلاب کے لیے انھوں نے نظام تعلیم کو کتاب اللہ سنت رسول اللہ پر مبنی کرنے کی ضرورت واضح کی تاکہ بچوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا کر ان کو اسلامی تربیت دی جا سکے. اسلامی نظام حیات نافذ کرنے کے متعلق ان کا یہ نظریہ تھا کہ سب سے پہلے دستور و حکومت کی بنیاد اسلام پر رکھی جائے تاکہ غیر اسلامی تصورات کو ترک کر کے سیاسی و معاشی نظام، اخلاق و عادات اور تہذیب و ثقافت کو اسلامی سانچوں میں ڈھالا جا سکے. قائد ملت اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ غیر اسلامی تصورات نے اسلامی دنیا میں تفریق و انتشار پیدا کر دیا ہے. وہ اتحاد و اخوت اسلامی کے علمبردار تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مسلمانانِ عالم احکام الہٰی کے مطابق اپنی زندگی کے ہر شعبہ کو اسلامی بنائیں اور ذہنی و فکری حدود سے بھی آگے بڑھ کر سیاسی معاشی، تمدنی ہر ایک اعتبار سے متحد و مستحکم ہو جائیں اور اپنی ایک

عالمگیر وحدت قائم کرلیں۔ چنانچہ ان کا یہ خیال تھا کہ پاکستان جس کی اساس مسلمانان ہند کی جداگانہ قومیت یعنی اسلامیت کو قرار دیا گیا ہے زندگی کے ہر شعبہ کو اسلامی اصولوں پر منظم کر کے دنیا کے سامنے اسلامی مملکت اور اسلامی زندگی کا قابل تقلید نمونہ پیش کرے تاکہ اسلامی نظام حیات کے وہ پہلو روشن ہو جائیں جن کو مسلمان حکمرانوں کے ملوکانہ مفاد نے ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔

از۔ جناب محمد مصلح الدین صدیقی۔ بی اے (عثمانیہ)

جہانے را دگر گوں کرد یک مرد خود آگاہے

مملکت آصفیہ کا محافظ اٹھ گیا مگر ہزاروں کو خطۂ دکن کا محافظ بنا دیا وہ عظیم اور مقدس ہستی گذر گئی جو ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کے مصداق تھی اور جس کا دل ہمدردی ایثار اور خلوص سے معمور تھا وہ ایسی ہستی تھی جس نے اصلاحات کے زمانے میں ہزاروں دشمنوں اور منافقوں کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا تھا یہ ایسا نازک وقت تھا جب کہ تمام دکن کی فضا زہریلے عناصر سے مکدر ہو چکی تھی۔ مخالفین مملکت آصفیہ اور دشمنان شاہ دکن پرچم آصفی کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے میں مصروف

تھے۔ مسلمانوں کا نام ونشان بالکل مٹنے کو تھا۔

ایسے قیامت خیز زمانے میں صرف ایک مردِ مجاہد نے مملکت آصفیہ پر دانت چبانے والوں کا نہایت دلیرانہ مقابلہ کیا اور اس طوفان خیز ہنگامہ میں آنکھوں کے سامنے اپنے بھانجے کی لاش کو تڑپتے دیکھا۔ حقیقت میں یہ وقت امتحان اور آزمائش کا تھا اس لیے ایسے ہی حق پرست اور صداقت شعار کی ضرورت تھی جو دنیوی جاہ وحشمت اور دولت وثروت سے قطعی بے نیاز ہو جس کا مذہب اللہ کا مذہب ہو، جس کی رگ رگ میں انتقام کا جذبہ کار فرما ہو جس کی فطرت میں پیدائش ہی سے بے باکی خود شناسی سخت کوشی اور باطل شکنی کے اوصاف موجود ہوں جو نگاہ کرم، شانِ استغناء اور خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو جس کی طبیعت میں حد درجہ سادگی انکسار حلم خوش مزاجی، ظرافت اور غرور وتکبر کا شائبہ تک نہ ہو۔ ان تمام اوصاف عالیہ کا پیکر اور اسم بامسمیٰ "محمد بہادر خاں" صرف ہمارا محبوب قائد تھا۔ اس کے نورانی چہرے پر ہمیشہ ہنسی کھیلتی جس سے دیکھنے والوں کی روح کو خوشی اور دل کو مسرت حاصل ہوتی وہ رونق عقل اور اس کی صحبت سے دشمن سے دشمن بھی اس کا دوست بن جاتا تھا۔ اس کے اخلاق حمیدہ غیروں کے لیے شمع ہدایت تھے۔ اس کی زبان ہمیشہ دوست دشمن کی دعا کے لیے کھلی رہتی اور اس کا دل دوسروں کی نیک تمناؤں کا متمنی رہتا۔ اس کا ہاتھ دوستی اور رحم وکرم کے لیے ہر وقت کھلا رہتا۔ ایسا سحر البیان مقرر تھا جس کے لیے ہزاروں لاکھوں افراد بے چین وقرار ہو جاتے اور گھنٹوں سننے کے بعد بھی ان کی طبیعت سیر نہ ہوتی زبان میں وہ تاثیر کہ لاکھوں افراد کو اپنا ہم خیال بناتی کبھی

مجمع میں ہنسی کا شور ہوتا تو کبھی آہ و زاری کا غوغا، کبھی پانی پڑ رہا ہو، کڑاکے کی سردی ہو رہی ہو اور چلچلاتی دھوپ کسی حالت میں بھی کیا مجال کہ کوئی شخص قائد ملت کے دوران تقریر اٹھنے کی کوشش کرے۔

قائد ملت کی تقریروں نے ہزاروں کو تڑپایا لاکھوں کے دلوں کو گرمایا اور ایسی شمع جلادی کہ پھونکوں سے نہیں بجھ سکتی۔ اس کی تقریر کی اعجاز آفرینی معجز بیانی اور سحر بیانی کا یہ عالم تھا کہ صرف چھ سات سالہ دور میں مسلمانانِ دکن میں خصوصاً اور مسلمانانِ ہند میں عموماً اسلام اور اتحاد کی روح پھونک دی اور ان کو مرکزی قوت بخشی۔ تمام ہندوستان میں اور حکومت ہند کے نزدیک مملکت حیدرآباد کی اہمیت اور اس کے وقار و عظمت کو ثابت کر دکھایا۔ مملکت حیدرآباد کی عظمت ماضی کی یاد تازہ کر کے غیروں کی نگاہوں میں اس کو اعلیٰ مقام دلایا۔ اس کی زبان صرف حق و صداقت کے لیے کھلتی اور باطل قوتوں کو توڑنے کے لیے آمادہ رہتی وہ ہر وقت "نیا طور" اور نئی برق تجلّی دکھلاتا۔ نغمۂ توحید کا ذکر جس مقام پر کرتا اس مقام کی تمام فضا روحانی ہو جاتی اور دشمنانِ قوم لرز جاتے۔ ہر وقت اس کی نئی شان اور نئی آن ہوتی۔ قہاری، غفاری، قدوسی اور جبروتی کا مظاہرہ دکھلاتا۔

وہ سحر البیان تھا اور اپنی قوت بیانیہ سے تعلیمات اسلامی کو موثر بناتا اور قرآن مجید کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کے ضمیر کی آواز ایسی قیامت خیز ہوتی کہ انسانوں کے دل تو کجا پہاڑوں کے دل بھی ہل جاتے۔ ذکر و فکر، علم و دین، عشق و محبت، فقر و قناعت، ستھی کردار تسلیم و رضا، آزادئ فکر، بیدار مغز، حقیقت شناس نظر خودگری اور خودنگری اور خود شکنی کا پیکر عمل تھا

اللہ تعالیٰ نے اس کو قیادت کے لیے مردِ مومن کے پورے جوہر اور انسانیت کے آداب سکھائے تھے۔ رات دن اس کا وظیفہ اقبال کا پیغام تھا۔ حتیٰ کہ جان بھی دی تو اقبال کے پیغمبرانہ اشعار کی تفسیر کرتے ہوئے۔ شاہ پرستی اور ملک و مالک کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری کا آخر تک دم بھرتا رہا۔ سیرتِ نبوی پر مرتے دم تک شعلہ نوا تقریریں کیں۔

شہیدِ ملت نے مختصر مدتِ حیات میں ملت اسلامیہ کی ایسی ٹھوس خدمات انجام دیں جس کی مثال مشاہیر کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ملت کے لیے ایثار اور خلوص کا ایسا لازوال نمونہ قائم کر دیا کہ عہدِ حاضر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ قائد ملت نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

میں ماں کے بطن سے صرف "محمد بہادر خاں" کے نام سے پیدا ہوا ہوں اور خالی ہاتھ آیا ہوں اعزازات اور جاہ و مناصب لے کر نہیں آیا ہوں اسی طرح میں "محمد بہادر خاں" کے نام سے اس جہانِ فانی سے کوچ کروں گا اور تہی دست جاؤں گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ ہمارا قائد جو الطل حریت تھا اسے فضائے عمل کا "شاہین" تھا جسے ناقابل عمل تحریکات اور بے جان الفاظ سے سخت نفرت تھی یہی وجہ ہے کہ ایک لمحہ کبھی ملت اسلامیہ کی خدمت سے غافل نہیں رہا اس نے اپنی آہ نیم شبی اور سوز دروں سے مسلمانانِ دکن میں بیداری کی روح پھونک دی سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے ایک ہی دُھن میں محو رہتا ہے اور وہ دُھن یہ تھی کہ مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان بن جائیں اپنا حقیقی مقام حاصل کر لیں اور تعلیمات اسلامی کو اپنے قلوب میں جذب کر لیں اس کو مسلمانوں سے ہمیشہ یہی شکوہ رہا مسلمانوں میں قوتِ عمل

بالکل مفقود ہوچکی ہے وہ پست ترین مقام پر آ گئے ہیں۔ ان کو اپنے حقیقی مقام پر پہنچانا مسلسل جد و جہد اور پیہم کوششوں کا کام ہے۔

مسلمانوں میں تعلیمات قرآنی کو عام کرنے کے لیے مجلس کی ہر شاخ پر یہ فرض عاید کیا تھا کہ اپنے اپنے مقامات میں تعلیمات قرآنی سے مسلمانوں کے قلوب کو منور کرتی رہے۔ قائد ملت کی پیہم جد و جہد کی وجہ سے قرآنی تحریک رفتہ رفتہ قوت حاصل کر رہی تھی۔ خود ترجمان حقیقت اپنے محلہ کی مسجد میں مسلمانوں کو درس قرآن دیتے رہے۔ وہ مسلمان انتہا درجہ خوش قسمت ہیں جنھوں نے قائد ملت کی زبان شیریں سے درس قرآن مجید سنا ہو اور اس سے مستفید ہوئے ہوں۔ دکن کے طول و عرض میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان ہوتا یا ان کے دلوں کو ٹھیس پہنچتی تو فوراً قائد کی آنکھوں سے آنسو جاری اور اس کا قلب مسلمانوں کے ہر قسم کے مفاد کے لیے حد درجہ مضطرب ہو جاتا چنانچہ قائد ملت کی زندگی میں سب سے زیادہ جانکاہ اور ناقابل فراموش واقعہ لاتور کی مجلس اتحاد المسلمین کے اراکین کے ساتھ چند مقامی حکام کا ناروا سلوک اور شیر دل مسلمانوں کا قتل ہے یہ واقعہ قائد ملت کے لیے سوہان روح نفس جانگداز ثابت ہوا۔ اور اتحاد المسلمین میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے لاتور کے مسلمانوں کے خون ناحق کا رنج و غم قائد ملت کے خونی آنسوؤں میں ظاہر ہوا۔ قائد ملت ہم سے چھین لیے گئے لیکن مسلمانان دکن کے دلوں میں روح انسانی اور جذبۂ حریت موجزن ہے جو لسان الامت کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ملت ختم نہیں ہوی اگرچہ کہ قائد کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ اس کی روح مقدس تمام مسلمانان دکن و ہند کی ہر جہتی

ترقی کی منتظر اور اس کا دل ضربِ کلیمی کی کارفرمائی دیکھنے کا آرزومند ہے۔ اس کی زندگی مجاہدانہ اور اس کا نام اور اس کا بیش بہا کام لازوال ہے جس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔

ہرکس وناکس کی درخشاں امیدوں کا مرکز ـــــ طالب علموں کا معین و مددگار ـــــ قوم و ملک کا حقیقی خادم اور شیدائی ـــــ

راما چاری کے الفاظ میں "ہندوؤں کا مہاتما"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جدل اور پیکار کا قائد ـــ اپنوں اور پرایوں میں ہر دلعزیز اعداء ان کا محبوب ۔ ۔ ۔ ۔ بلبل ہند کا فرزند دلبند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلامی اخلاق کردار اور مروت کی جیتی جاگتی تصویر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سراپا عشق و مستی اور عالم باعمل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طبع بلند ـــ مشرب تابے وہ لے گر رہے لگا ہے۔ پاک بینے اور جان بے تابے کا مظہر اتم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دریائے شعر و ادب کا بہترین شناور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیباکانہ صفات سے متصف ـــــ بساط سیاست کا بہترین مہرہ ـــ مسلمانوں کے قلب و روح ـــ ولولہ جوش تفکر اور تدبر سے مملو ـــــ پیر ہندی کا باعمل روحانی مرید ـــــ سیرت نبوی کا پیکر ـــ مجسم حق و صداقت ـــ بے بسوں اور بے کسوں کا اَن داتا ؎

بیا جاناں تماشہ کن کہ در انبوہ جانبازاں
بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم

کا للکارنے والا ـــــ مسلمانوں کی تقدیر کو آن کی آن میں بدل دینے والا مردِ مومن ہم سے رخصت ہو گیا۔ ملت اسلامیہ کی متاع گراں بہا جاتی رہی سحر البیان خطابت ختم ہو چکی۔ وہ خطیب با کمال جو اردو ادب ـــ کا

لافانی سرمایۂ افتخار تھا ۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مبلغ گذر گیا وہ عظیم شخصیت چل بسی جس کی والہانہ محبت میں تمام مسلمانانِ دکن و ہند ڈوبے ہوئے تھے اور

"ایک شیر زیاں ہے کہ کوڑا جھوم رہا ہے"

کی زندہ تصویر ہماری آنکھوں سے اچانک غائب ہو چکی ہے

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ابراھیم جلیس

وغیرہ وغیرہ

دنیا کا ہر بڑا آدمی اپنی نجی زندگی میں بڑا زندہ دل، شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور حاضر جواب ہوتا ہے۔

دنیا کے کسی بھی بڑے آدمی کی نجی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص جو بظاہر کتنا سنجیدہ نظر آتا ہے اور جس کے بارے میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کبھی مسکراتا تک نہ ہوگا وہی شخص اپنی ذاتی زندگی میں

کیسا باغ و بہار آدمی ہے۔

دنیا کے سارے بڑے آدمیوں کی طرح بہادر یار جنگ مرحوم کی زندگی بھی ایسے ہی ایک خوشگوار تضاد کا مجموعہ ہے۔

بہادر یار جنگ جہاں منظر عام پر نہایت سنجیدہ اور گمبھیر نظر آتے تھے وہ اپنی پرائیوٹ زندگی میں اتنے ہی خوش گو، شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔

ان کی زندہ دلی کے بیشتر واقعات زبان زد خاص و عام ہیں لیکن راقم الحروف کے حیطۂ ذہن میں جو واقعات رہ گئے وہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ریاست حیدرآباد دکن کے ایک جاگیردار پرتاب گیرجی کی کوٹھی میں کوئی تقریب منعقد تھی۔ اس میں بہادر یار جنگ بھی مدعو تھے لیکن ابھی وہ وہاں پہنچے نہ تھے۔ البتہ حاضرین کا موضوعِ گفتگو بہادر یار جنگ ہی تھے مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کے ایک سرگرم رکن ابوالبیان خواجہ بہاؤالدین حاضرین سے کہہ رہے تھے۔

"ارے صاحبان — بہادر یار جنگ کیا ہیں، پہلے یہ دیکھیے کہ بہادر یار جنگ کو بہادر یار جنگ کس نے بنایا۔ ظاہر ہے کہ میں نے بنایا ہے اگر میں بہادر یار جنگ کو متعارف نہ کراتا تو آج بہادر یار جنگ کو کون پوچھتا"۔

اسی اثنا میں بہادر یار جنگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ایک منہ پھٹ شخص سے جو خواجہ بہاؤالدین کی باتیں سن رہا تھا نہ رہا گیا اور اس نے براہ راست بہادر یار جنگ سے پوچھا۔

"نواب صاحب۔ کیا یہ سچ ہے کہ بہادر یار جنگ کو بہادر یار جنگ۔ الوالبیان خواجہ بہاؤالدین نے بنایا ہے؟"

نواب صاحب نے کہا۔ "بھائی جان الوالبیان خواجہ بہاؤالدین صاحب نے مجھے بنایا ہو یا نہ بنایا ہو البتہ انھوں نے آپ کو ضرور بنایا ہے۔"

پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نواب صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے بے تکلفی کے باعث دونوں میں اکثر فقرہ بازی ہوا کرتی تھی ایک دن پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم نے نواب صاحب کی قوتِ خطابت پر لطیف سی چوٹ کی کہ۔

"نواب صاحب۔ جھوٹے کی زبان بڑی چلتی ہے۔"

نواب صاحب نے اس چوٹ کو فوراً محسوس کرلیا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "جی ہاں۔ تب ہی تو خلیفہ پروفیسر ہو جاتے ہیں۔"

اتحادالمسلمین کے ایک مشہور لیڈر نے نواب صاحب کو ایک خط لکھا۔ جس میں انھوں نے اتحادالمسلمین کے بجائے صرف "اتحاالمسلمین" لکھا یعنی بیچ سے حرف د غائب تھا۔

اس پر نواب صاحب نے ان مشہور لیڈر سے پوچھا۔

"مولانا ۔ یہ دال خوری آپ نے کب سے شروع کر دی ہے۔"

نواب صاحب کی فقرہ بازی کی زد سے ان کی بیگم صاحبہ تک محفوظ نہیں رہیں۔ نواب صاحب اپنی بیگم صاحبہ کا یہ واقعہ اکثر دوستوں کو سناتے تھے اور خود بڑا لطف اٹھاتے۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ نواب صاحب کے چھوٹے بھائی نواب دولت خاں نے ایک دن اپنی بھاوج (بیگم بہادر یار جنگ) سے کہا کہ۔

"بھائی سے کہہ کر مجھے کسی پیڈ پروبیشنری (PAID PRABATION-ERNY) کی آسامی پر مامور کرا دیجئے۔

بیگم صاحبہ نے پیڈ پروبیشنری کا مطلب کچھ اور سمجھا چنانچہ انھوں نے نواب صاحب سے کہا۔

"آپ دولت خاں کی "پیٹ پرورش" کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کرتے۔"

نواب صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ پیڈ پروبیشنری کا ترجمہ پیٹ پرورش سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

نواب صاحب کے دروازے سے کوئی شخص مایوس نہیں گیا۔ چاہے کام ان کی طبیعت کے بالکل ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ چنانچہ نواب صاحب کے ایک قریبی عزیز جناب ضیاء الدین خاں لودھی حال مقیم کراچی ایک واقعہ سناتے ہیں کہ ایک بار وہ نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ۔

"ایک سینما ہال تعمیر کرنا چاہتے ہیں اجازت کے لیے براہ کرم کلکٹر صاحب کے نام ایک خط دے دیجئے۔"

اس پر نواب صاحب نے کلکٹر کے نام ایک خط لکھا جس کا متن یہ تھا۔

"میں نہ خود کبھی سینما دیکھتا ہوں اور نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ کوئی سینما دیکھے۔ لیکن بزرگوں نے یہ بھی نصیحت کی ہے کہ۔ ع

برائے خاطر یاراں تو آں کُہ بہ شراب

پرانے زمانے کے مسلمان روپے دے کر گناہ کرتے تھے اور آج کل کے مسلمان روپیہ جمع کر کے گناہ کر رہے ہیں۔ گناہ کے بغیر نیکی کا صحیح تصور نہیں پیدا ہو سکتا اس لیے ضیاء الدین خاں لوزی کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔

نواب صاحب کی زندہ دلی، شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے بے شمار واقعات ہیں جن کے لیے ضخیم سے ضخیم دفاتر درکار ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ وہ ان سارے واقعات کو پیش کر سکے۔ لہٰذا نواب صاحب کی اس منظوم شوخ بیانی کا ایک اور واقعہ پیش کرتا ہوں۔

آگاہ رموز دین فطرت ہوں میں
کچھ مجھ سے سنو لسان الامت ہوں میں
میں خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم
شاہنشہ اقلیم خطابت ہوں میں

"مثال مردِ مومن" نواب بہادر یار جنگ جہاں مسلمانانِ ہند کے عظیم محسن اور ایک بے مثال مقرر اور خطیب تھے وہاں وہ صدر درجہ شگفتہ طبع اور حاضر جواب بھی تھے وہ زاہد تو تھے لیکن زاہد خشک نہ تھے وہ اپنی ظرافت طبع سے نجی محفلوں کو قہقہہ زار بنادیا کرتے تھے۔ نواب بہادر یار جنگ کی سوانح حیات اور ان کے قریبی دوستوں اور عزیزوں سے ان کی لطافت کے چند واقعات بطور تبرک قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

بہادر یار جنگ کی انگریزی تعلیم صرف میٹرک تک تھی لیکن میدانِ سیاست میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے اپنی ذہانت سے چند ماہ میں انگریزی سیکھ لی کہ قائدِ اعظم مرحوم سے تک بے تکان انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور ایک بار تو انھوں نے ایک پبلک جلسے میں نہایت فصیح انگریزی میں تقریر کر کے انگریزی کی شہرہ آفاق مقررہ بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کو حیران کر دیا تھا۔

انھوں نے ایک پبلک جلسے میں مسز سروجنی نائیڈو کو مخاطب کرتے ہوے کہا اگر مسز سروجنی نائیڈو اردو جیسی مشکل زبان میں تقریر کر سکتی ہیں تو کیا بہادر یار جنگ انگریزی جیسی آسان زبان میں تقریر نہیں کر سکتا۔

۱۹۳۱ء میں نواب بہادر یار جنگ بلادِ اسلامیہ کے سفر کے دوران قاہرہ تشریف لے گئے۔ ان دنوں مصریوں کو ہندوستانی مسلمانوں سے اختلاف تھا کہ ہندوستانی مسلمان قرآن پاک کا ترجمہ کرتے ہیں۔ ایک دن نواب صاحب جامعہ ازہر قاہرہ کے پرنسپل کے ہاں مدعو تھے۔ پرنسپل صاحب نے یہی موضوع

چھیڑ دیا اور طنزیہ انداز میں نواب صاحب سے کہا۔
"آپ ہندوستانی لوگ تو قرآن مجید کا بھی ترجمہ کرتے ہیں:"
نواب صاحب طنز کو فوراً سمجھ گئے اور بولے۔
"قبلہ۔ ترجمہ تو نہیں کرتے البتہ ترجمانی کرتے ہیں اور اس میں قباحت کی کیا بات ہے۔

ایک بار نواب بہادر یار جنگ ایران کے سفر پر روانہ ہوئے تہران میں مرحوم کو کسی مقام تک جانا تھا۔ انھوں نے سڑک پر ایک ٹیکسی کار روکی اور ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔
"فلاں مقام تک کا کیا کرایہ لوگے؟"
ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا آپ کتنے آدمی ہیں؟ بہادر یار جنگ اکیلے تھے لیکن فرمایا۔ "دو"۔ اس پر ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا۔
"فی کس اتنا کرایہ ہوگا۔"
نواب صاحب نے فرمایا "کرایہ تو ایک ہی شخص کا دوں گا لیکن جائیں گے دو"
ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "تو پھر آپ کو نہیں لے جاؤں گا۔"
تو نواب صاحب نے ہنس کر فرمایا "بھیا میرے ساتھ میرا خدا ہے کیا خدا کا کرایہ لوگے؟"
ٹیکسی ڈرائیور نواب صاحب کے اس جواب سے بڑا متاثر اور شرمندہ ہوا۔

راہی کے قلم سے

فاصلے

بیگم بازار سے مشیرآباد تک چھ سات میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اب پھر کیا بنے گا آج دکن کی خاک سے ابھرنے والا یہ نیا خورشید اندھیرا بڑھتے بڑھتے ایک روز پورے حیدرآباد پر محیط ہوگیا۔ ہر روز جب رات کا وزن بڑھتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشیرآباد کے ویرانوں سے ایک آواز آرہی ہے۔

"حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں"

نصیب یاور جنگ کی ڈیوڑھی سوگ میں ڈوبی کھڑی تھی۔ نوبت و نقارے خاموش تھے۔ پہرہ دار عروب مرجھائے چہرے لیے رنج و الم کی تصویر بنے ہوئے تھے حیدرآباد کا ہر راستہ بیگم بازار جاتا تھا اور بیگم بازار میں کھڑی ہوئی بیت الامت کی عالیشان عمارت کی مردانی بیٹھک میں لسان الامت محو خواب تھا۔ نیند ابدی نیند۔ وہ نیند جس پر سینکڑوں بیداریاں قربان۔ دو سو سال سے مست نیند میں کھڑے ہوئے انسانوں کو بیدار کرتے کرتے اس نے خود اپنے اوپر نیند طاری کرلی تھی۔ شاید وہ جدوجہد زندگی اور کشمکش حیات سے تھک

گیا تھا۔ شاید وہ زمانہ سے مایوس اور اپنوں سے ناامید ہو چکا تھا۔ اس نے نیند کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ لی، آخری پناہ۔ جہاں نہ اپنے رُلا سکتے ہیں اور نہ غیر منا سکتے ہیں۔ جہاں نہ شاہوں کا ظلم چل سکتا ہے نہ سازشوں کی چال۔ جہاں نہ کنگ۔ کوٹھی کا منحوس سایہ پڑ سکتا ہے اور نہ ریذیڈنسی کا بز دلانہ ہتھیار۔ جہاں صرف ایک سکون ہے نہ ٹلنے والا ہمیشہ سکون۔ جہاں وہ خالق ارض وسماوات کے روبرو اپنا درد دل سنا سکتا ہے۔ اے مالک حقیقی تو نے اس حقیر بندہ سے جو کام لینا چاہا وہ اس نے اپنی بساط بھر کرنے کی کوشش کی۔ تو نے گویائی عطا کی اور میں نے اپنی آتش بیانی سے انسانی قلوب کو گرما دیا۔ تو نے سوز عطا کیا۔ میں نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا۔ تو نے میرے دل میں دھڑکن پیدا کی تو نے مجھے زندگی کے راز سمجھائے اور میں نے انسانوں کو جینے کا ڈھنگ سکھلا دیا۔ تو نے مجھے رموز حیات بتلائے اور میں نے انسانوں کے آگے اسرار حیات کھول دیئے تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ پستیوں میں گرے ہوئے انسانوں کو اٹھاؤ۔ میں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے ان کو اٹھانے کی کوشش کی تیرا حکم تھا کہ جگاؤ ان نیند کے متوالوں کو جگاؤ۔ میں نے ان کو گہری نیند سے جھنجھوڑنے کی کوشش کی تیرا حکم تھا کہ ان مردوں کو زندہ کرو۔ میں نے ان مردوں میں روح پھونکی۔ لیکن آج میں ایک حقہ سے مر گیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ بنجارہ ہلز پر کھڑے شاندار بنگلہ کے اندر کھیلے گئے گھناؤنے ڈرامے کے کسی کردار سے مجھے شکوہ نہیں۔ یہی مشیت تھی۔ یہی نوشتۂ تقدیر تھا۔ مجھے کسی سے کچھ کہنا نہیں سننا نہیں۔ کہنا ہے تو صرف تجھ سے کہ اے پروردگار میرے پیچھے رونے والے ان لاکھوں انسانوں کو سہارا دے۔ تسبیح کے بکھرے ہوئے ان دانوں کو میں نے اپنی طویل جدوجہد سے ایک دھاگے میں

پرونے کی جو کامیاب کوشش کی تھی اس کو بکھرنے نہ دے۔ میں نے اپنے خونِ جگر سے جس گلشن کو سینچا ہے اس کو خزاں رسیدہ نہ ہونے دے۔ میں نے جس زمین کو زرخیز بنایا ہے اس کو بنجر ہونے سے بچا۔ میرے نالہ ہائے نیم شبی نے دلوں میں جو گداز پیدا کیا ہے اس کو باقی رکھ۔ میری عمر بھر کی کمائی لاکھوں انسانوں کا یہ لٹا پٹا قافلہ ہے جس کو میں نے منزل کے راستہ پر لگا دیا ہے اس کی نگہبانی کر۔ رہزنوں سے اس کو بچا۔ میں نے خون پسینہ ایک کر کے منزل کی طرف بڑھنے والے اس کارواں کو پیدا کیا ہے اس کو راستہ میں الٹ جانے سے بچا۔

بیت الامت کے وسیع دالان کے ایک کونے میں کھڑا ہوا میں اس گورے چٹے وجیہہ پٹھان کے چہرہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جس پر موت نے مکمل سکوت طاری کر دیا تھا لیکن جس کی مسکراہٹ پیامِ زندگی دے رہی تھی جس کے چہرہ پر بکھرا ہوا نور عزمِ راسخ پیدا کر رہا تھا۔ موت کے اندھیاروں میں ہمیشہ کے لیے کھو جانے والا یہ شاہین دعوتِ سفر دے رہا تھا۔ میرے دماغ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میرے جذبات میں ایک تلاطم برپا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میری زندگی وحشتوں میں ٹھوکریں سی کھا رہی ہے۔ میری حیات زندگی کے نام سے گھبرا رہی ہے۔ جاگیرداری کوٹھی پر طاری اس سوگوار فضا میں، میں نے دیکھا کہ ہزاروں مظلوموں کا یہ کارواں اپنے میرِ کارواں کی بارگاہ میں نذرِ عقیدت پیش کرتا ہوا آہستہ آہستہ گذر رہا ہے۔ بے کسوں، مجبوروں اور سوگواروں کا یہ قافلہ تخت پر لیٹے ہوئے بہادر خاں کے سرہانے سے اس قدر آہستگی کے ساتھ گزرتا تھا کہ کہیں محوِ خواب قائدِ ملت کے آرام میں خلل نہ ہو۔ میری نظروں کے سامنے ایک پردہ سا آ گیا اور میں نے دیکھا کہ ہزاروں

لوگ: اسمبلی اسٹیشن اور اس کے اطراف بے چینی سے اپنے محبوب کا انتظار کر رہے ہیں اور پھر جب لوگوں کے ہجوم میں کشمیر کے ڈوگرہ شاہی کی گولی سے زخمی ہونے والے بہادر کا مسکراتا چہرہ ان کی حد نظر میں آگیا تو لوگوں کی آنکھوں کے آنسو نکل پڑے ہزاروں ہاتھ ایک ساتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے کہ اب ان کا محبوب زندہ سلامت پھر ان کے درمیان آگیا. ہزاروں زبانوں سے نکلا کہ تم زندہ رہو تمہاری آئی ہم کو آجائے خدا ہم سب کی عمریں تم کو دے دے. بیت الامت میں اژدہام بڑھ رہا تھا لوگ حیران تھے کہ سیسہ کی پگھلی ہوئی گولی سے بچ جانے والا یہ بہادر حقہ کے ایک کش سے مر گیا.

میری نظروں نے دوسرا منظر دیکھا. ہزاروں کے مجمع پر سکوت طاری ہے. خطابت کا دریا بہہ رہا ہے ابر رحمت جوش میں آیا موسلا دھار بارش ہونے لگی لوگوں نے چھتریاں کھولنی چاہیں. آواز گونجی کہ میری بات سننا چاہتے ہو تو پڑتے پانی میں بیٹھے رہو. کھلتی ہوئی چھتریاں بند ہو گئیں اٹھنے ہوئے لوگ بیٹھ گئے اور پھر بیان کا وہ سحر چھایا کہ لوگ مبہوت دم بخود، پانی میں شرابور بیٹھے ہیں. خطابت کا دریا بہہ رہا ہے بارش اور بڑھ رہی ہے. ادھر قدرت کو یہ ضد آج بہادر خاں کو یہ ہٹ ہے کہ آج میں اپنے دل سے ان ہزاروں دلوں کو ٹکراؤں گا اور اس ٹکراؤ سے وہ شعلہ پیدا کروں گا جو کسی جھونکے سے نہ بجھایا جا سکے. طوفانی بارش اور چھائے ہوئے خلوص کے درمیان مسلسل ایک گھنٹہ کی جدوجہد میں خلوص کی جیت ہوئی. طوفان کو یہ ماننا پڑا کہ دل سے نکلنے والی بات اثر رکھتی ہے. بیت الامت میں اژدہام بڑھ رہا تھا لوگ حیران تھے کہ دکنی سطح مرتفع کو جو الاملهی بنانے والا

شعلہ آج کیوں بجھ گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے تیسرا منظر تھا۔ بیگم بازار کی چھوٹی سی مسجد میں نماز فجر کے بعد بوریے پر بیٹھ کر قرآن کے اسرار کھولنے والا مفسر آج جانماز پر بیٹھا ہچکیاں لے رہا تھا۔ بھرے بھرے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ خوبصورت آنکھیں سرخ انگارہ بن گئی تھیں۔ بھاری بھرکم جسم کانپ رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دل پھڑ پھڑا کر سینہ سے نکل جانا چاہتا ہے۔ لرزتی آواز میں اس نے کہا آج مجھ سے تفسیر نہ سنو محمد علی جناح پر چلائے ہوئے چاقو نے میرا دل زخمی کر دیا ہے۔ یہ چاقو جناح پر نہیں مسلمانوں کی رگ حیات پر چلایا گیا ہے۔ مجھ سے آج تفسیر نہ ہوگی صرف خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میری عمر اس کو دے دے۔ تفسیر نہ ہو سکی اس لیے کہ آج اس کا دل اپنے محبوب سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ بیت الامت میں اثر دعام بڑھ رہا تھا لوگ حیران تھے کہ دم سرزل کے لیے ہچکیاں لے کر رونے والا آج ہمارے رونے پر خاموش کیوں سا ہے۔

میری نظروں کے سامنے پردے آتے اور ہٹتے گئے۔ کہیں میں نے دیکھا کہ سرحد کے خودسر پٹھانوں کو یہ دکنی پٹھان ایک مرکز پر جمع کر رہا ہے۔ کبھی پیر دل کی سرزمین پنجاب میں لا الہ کی ضرب لگا رہا ہے کبھی بلوچی ریگستان میں پیر پگارو جیسی جنگجو شخصیت کو دعوت فکر دے رہا ہے، کبھی کراچی کے ساحل پر کھڑا ہر ملک ملک امن کا نعرہ لگا رہا ہے تو کبھی مدراس کی بندرگاہ سے عتصموا بحبل اللہ کی تعلیم دے رہا ہے کبھی میں نے دیکھا کہ جاگیردارانہ ماحول کا پروردہ یہ مہذب جاگیردار گاؤں کے غیر مہذب اور جنگلی لوگوں کے ساتھ درخت کے نیچے بیٹھا کھانا

کھانا کھا رہا ہے، تو کبھی خاندانی لباس میں ملبوس سفید انگرکھا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے سر پر جمعداری کا طرا شملہ باندھے بازو میں حیدری شمشیر حمائل کیے یہ نواب زادہ عیدگاہ میں آئے ہوئے ہزاروں لوگوں سے مصافحہ کر رہا ہے۔ پیشانی نور ایمانی سے چمک رہی ہے مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح لبوں پر پھیلی ہوئی عقابی آنکھیں ہر ملنے والے کا جائزہ لیتی ہوئیں۔ چوڑا چکلا سینہ جس کے اندر مخلص و پرسوز دل ہمیشہ کی طرح دھڑکتا ہوا۔ ہر عقیدت مند کے دل کی دھڑکن کو اور بڑھاتا ہے۔ بیت الامت میں اژدہام بڑھ رہا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ ہمیشہ دھڑکنے والا یہ دل آج کیوں رک گیا۔

میرے ذہن میں نقوش ابھرتے اور مٹتے گئے یادیں تازہ ہوئیں اور ڈوبتی گئیں۔ خیالوں کے جال بنتے اور بگڑتے گئے ماضی سے رشتہ جڑتا اور ٹوٹتا گیا۔

میرے جذبات میں طوفان اٹھ رہا تھا، مجھ پر دیوانگی چھا رہی تھی بیگم بازار سے مشیرآباد تک چھ سات میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اب میرا کیا بنے گا۔ آہ آج دکن لاوارث ہو گیا۔ آہ آج تیغ عالمگیر و ٹیپو کی امانت اٹھ گئی، دلوں کا تاجدار چلا گیا۔ منزل کا نشان دینے والا ستارہ ڈوب گیا۔ دکن کی خاک سے ابھرنے والا یہ نیا خورشید ہمیشہ کے لیے گہرے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا اب اندھیرا چھا رہا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا اور سیاہی پھیل رہی ہے اور یہ اندھیرا بڑھتے بڑھتے سارے شہر پر محیط ہو گیا۔

گذشتہ بیس سال میں تاریخ نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا۔ لیکن بازار سے مشیر آباد کا یہ فاصلہ میرے سینے پر ایک بوجھ بنا ہوا ہے۔ معلوم نہیں

یہ کبھی طے بھی ہوگا یا نہیں۔ ہر روز جب رات کا وزن بڑھتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشیرآباد کے ویرانوں سے ایک آواز آرہی ہے :

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

از : مولوی قاضی عبدالغفار صاحب مدیر "پیام"

قائدِ ملّت کی مرگِ مفاجات

مسلمانانِ دکن کی قومی زندگی کا بہت بڑا المیہ : قائد ملت

بہادر خاں مرحوم و مغفور کی وفات مسلمانان دکن کی زندگی میں ایک ایسا حادثۂ عظیم ہے جس پر ماتم کرنے کے لیے نہ قلم میں طاقت، نہ زبان میں قوت۔ وہ اب اپنے رب کے جوار رحمت میں محوِ خواب ابد ہیں۔ ان کی یاد میں آنسو بہانا ایک تقاضائے فطرتِ انسانی ہے لیکن اس تقاضے سے بھی بڑا تقاضہ ان کے پیام اور ان کے کام کو زندہ رکھنا ہے۔ یہی ان کی سب سے بڑی یادگار ہوگی اور یہی وہ میراث ہے جو وہ اپنی قوم کے لیے دنیا میں چھوڑ گئے ہیں۔ یہ وقت ان مسائل پر بحث کرنے کا نہیں ہے جن کے لیے مرحوم نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ایک مرد مجاہد کی طرح اپنی عمر کے آخری لمحہ تک صرف کیا۔ ہمیں اب یہ سمجھنا ہے کہ ان کے حصہ کا کام جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کیا تھا وہ انجام دیئے گئے اور اب ان کے [illegible] شیرازہ کو قائم رکھنا ان لوگوں کا کام ہے جو ان کے بعد باقی ہیں

قائدِ ملت کی مرگِ مفاجات مسلمانانِ دکن کی قومی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ وہ اسلامیانِ دکن کے دلوں میں اپنا جو نقش چھوڑ گئے ہیں اس کو غم و الم کے ہنگامی اور عارضی مظاہروں میں صرف ہونے کے بجائے جہدِ حیات کے میدانِ عمل میں سجدہ گاہِ صاحب نظراں ہونا چاہیے۔ اب جب کہ وہ محبوب شخصیت ہمارے درمیان نہیں ہے مرحوم کی یاد میں دلوں کی بیقراری کا مداوا صرف وہی ایک نوید ہو سکتی ہے جو مردِ مجاہد کے لیے کلامِ پاک کے ان الفاظ میں بھیجی گئی ہے کہ، اُولٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔

اداریہ سہ روزہ تنظیم قائدِ ملت نمبر

ملت کے آنسو

ملتِ اسلامیہ کی امیدوں کا چراغ ابھی سلگا ہی تھا کہ اس پر حسرت و یاس کی ہوا کے خطرناک جھونکے حملہ آور ہونے لگے۔ ابھی ہماری کشتی ساحل پر پہنچ ہی رہی تھی کہ ہم نے دیکھا کہ ہمارا ناخدا اسی کو کشتی والوں کے حوالے کر کے خود رحمت کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ ابھی ہم میں زندگی پیدا ہی ہو رہی تھی کہ داعیِ اجل نے ملتِ اسلامیہ کے نباض کو لبیک کہتے ہوئے سنا۔ ابھی دکن کے افق پر آفتاب طلوع ہوا ہی تھا اور ہم اس کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ موت کا غبار اٹھا

اور ہماری آنکھوں سے اس کو دیکھنے کی طاقت چھین لیا لیکن آفتاب کی تمازت
ابھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ ۳۰ رجب کی شام آئی اور اپنے ساتھ
افلاس اور نحوست کا پیام لائی۔ اس رات ملت اسلامیہ بلکہ عالم اسلام کے
لیے نحوست کا ستارہ طلوع ہوا اور دکن کا یہ شاہ خاور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
غروب ہوگیا۔ رات کے دس ہی بجے تھے کہ ملت اسلامیہ کے محبوب قائد کے
انتقال پر ملال کی دل خراش اور دل شگاف خبر نہایت سرعت کے ساتھ سارے
شہر میں پھیل گئی لیکن ہر شخص اس خبر کی صداقت پر مشکل ہی سے یقین کر رہا تھا
ہر کوئی اس کو صحیح سمجھنے کے لیے آسانی کے ساتھ تیار نہیں تھا۔ ہر کسی کی یہی تمنا
تھی کہ یہ خبر غلط ثابت ہو۔ سب کے سب اپنے محبوب قائد کی سلامتی کے لیے
دعائیں مانگتے دیوانہ وار گھروں سے نکل پڑے۔

اس رات قائد ملت ایک دعوت میں مدعو تھے۔ اسی دعوت میں خدائے
بزرگ و برتر نے بھی اپنے محبوب بندے کو دعوت دی اور خدا کا یہ اطاعت
گزار اور غربا نواز بندہ جس کا ہر عمل رضائے مولا کے لیے تھا فوراً اپنے رب
کے حضور میں حاضر ہوگیا۔ بندوں کی دعوت کو ٹھکرا کر دنیاوی مروتوں کا ذرا
بھی لحاظ کیے بغیر اپنے پیدا کرنے والے کی دعوت کو قبول کر لیا جس نے زندگی بھر
بے مروتی کو اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دیا۔ اور جس نے تمام عمر کسی کے دل کو توڑنا
گناہ سمجھتا رہا وہ آج تمام مروتوں کو ٹھکرا کر اور کئی دلوں کو توڑ کر اپنے پیدا کرنے والے
کی آواز پر لبیک کہتا ہوا ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا۔

مہمانوں سے بھرا گھر دم بھر میں ماتم کدہ بن گیا۔ میزبان اور تمام مہمان ماتم
گساری میں مصروف ہوگئے۔ ابھی ابھی سب ہنس رہے تھے اور ابھی ابھی سب

رونے لگے جس گھر سے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں اس گھر سے آہ وبکا کی
صدائیں آنے لگیں جس گھر میں خاص خاص لوگ مدعو تھے اسی گھر میں تھوڑی دیر
بعد عوام کا کثیر مجمع اپنے محبوب قائد کی غیر متوقع وفات پر خون کے آنسو بہا رہا
تھا۔ ہر ذی روح اپنے روح پرور کی موت پر چلا رہا تھا۔ ہر آنکھ اپنے کو بصیرت عطا
کرنے والے کی موت پر آنسو بہا رہی تھی، ہر ہاتھ اپنے کو قوت بخشنے والے کی موت
پر سینہ پیٹ رہا تھا سب کے سب ماتم کر رہے تھے اپنی قسمت پر اپنے قائد
کی وفات پر اس کی موت پر جس نے ہم میں زندگی پیدا کی جس نے ہم کو قوت بخشی
جس نے ہم کو استقامت عطا کی جس نے مایوسی کو کفر بتایا۔ جس نے مصیبتوں میں
میں بھی مسکرانے کی تلقین کی جس نے بیکسوں اور مجبوروں کی مدد کی جس نے
یتیموں کی سرپرستی کی جس نے امارت کو غربت پر سے قربان کر دیا۔ جس نے باطل
کی قوتوں کو کچل ڈالا جس نے حق پرستی اور حق گوئی کا بول بالا کیا جس نے اپنے
عمل سے رواداری کی ایک زبردست اور بے نظیر مثال قائم کر دی جس نے
ہمارے قلوب میں بیداری کا جذبہ پیدا کیا جس نے غیروں کی نگاہوں میں ہمارے
لیے عزت اور سربلندی پیدا کر دی جس نے ہمیں ایک زبردست سیاسی عظمت
اور وقار کا حامل بنا دیا۔ ہم تو اس کی بے وقت موت پر اپنے جیب اور دامن
کی دھجیاں اڑا رہے تھے جس نے ہماری بروقت رہنمائی کی۔ جب ہم خواب غفلت
میں پڑے سو رہے تھے، موت کو حیات تصور کر رہے تھے، ذلت کو عزت اور زوال
کو عروج سمجھ رہے تھے۔ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں اچھے اور
برے کی تمیز کا مادہ نہیں تھا۔ دوست اور دشمن کی پہچان نہیں تھی۔ ہم مصیبتوں کا
شکار ہو کر ذلتوں کی ٹھوکریں کھا کر کبھی کبھی آنے والی بربادیوں سے بچنے کے لیے

بے قرار ہوتے تو طرح طرح کی تدبیریں سوچتے نئے نئے طریقے ڈھونڈتے لیکن بالآخر ہماری پریشانیاں اغیار کے آشیانوں پر محو سجود ہو جاتی تھیں اور ہمارے نزدیک یہی ایک نجات کا راستہ تھا لیکن تو نے ہماری پریشانیوں کو آزاد کرایا اور تمام دنیاوی راستوں سے ہٹا کر اس سے راستہ جوڑنے کی تلقین کی جو دین اور دنیا میں ہمارے لیے عزت و اقبال کا شرف و امتیاز پیدا کرتا ہے ...
شکل و صورت کا اعتبار کرتے ہم انسان کہلاتے تھے لیکن ہم میں کوئی انسانی زندگی نہیں تھی، ہم میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے ہماری انسانی زندگی کا ثبوت مل سکے۔ ہم دماغ رکھتے ہوئے بھی دوسروں کے دماغ سے سوچتے تھے، بولنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتے ہوئے بھی ہم دوسروں کی آواز سے بولتے تھے پاؤں میں چلنے کی طاقت اور قوت رکھتے ہوئے بھی ہم دوسروں کی پشت پناہی اور ہمت افزائی پر دوسروں کے لیے اپنے قدم آگے بڑھاتے تھے۔ مختصر یہ کہ ہماری مثال بالکل چارپایوں کی سی تھی۔ غفلت کی سرشاری نے ہمیں انسانیت سے محروم کر دیا تھا لیکن تو نے اپنی ایک صدائے غفلت شکن سے ہماری آنکھیں کھول دیں اب ہمارے غور و فکر کو دوسروں کے دماغوں کی ضرورت نہیں اور ہم اپنی آواز کی پوری طاقتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ بولنے لگے ہیں۔ ہم اپنے مقام کو بھول چکے تھے۔ اپنی عظمت کو ایک قصۂ ماضی سمجھ رہے تھے۔ دوسروں کے آگے سجدہ کر رہے تھے غیروں سے بھیک مانگ رہے تھے۔ بجائے دوسروں کو نجات دلانے کے ہم خود انہی سے نجات کی راہ دریافت کر رہے تھے لیکن تو ہماری شان و شوکت اور عزت و عظمت کے ترانے گاتا ہوا آیا اور ہم کو ہمارا بھولا ہوا مقام بتلایا اور اس مقام پر پہنچنے کے راستوں اور طریقوں سے آگاہ کیا تو نے بتلایا کہ ہم دنیا

میں غلام رہنے کے لیے نہیں بلکہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے بھیجے گئے ہیں. ہم ذلت اور پستی میں رہنے کے لیے نہیں بلکہ عزت اور عظمت سے زندگی گزارنے اور دوسروں کو شان و شوکت کی زندگی بخشنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں. ہم ہیں خدا کے خلیفہ ہیں. ہم دنیا میں محکوم رہنے کے لیے نہیں بلکہ دنیا پر حکومت کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں. ہم دنیا میں بدبختی اور بدقسمتی کی زندگی گذارنے کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی قسمتوں کو بدلنے کے لیے بھیجے گئے ہیں. ہم دنیا میں ظلم سہنے اور مظلوم رہنے کے لیے نہیں بلکہ دنیا سے جور و ظلم اور جبر و استبداد کو مٹانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تو نے ہم کو ہماری صلاحیتوں سے واقف کروایا اور تو نے ہی بتلایا کہ ہم اپنے مالک ہیں ہم خود مختار اور آزاد ہیں. تو نے ہی بتلایا کہ راہ حق میں سر بکف ہونا اور جاں فروش بن جانا ہماری مشہور عادت اور پرانی صفت ہے.

آج قائد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی بے وقت موت پر سب رو رہے ہیں. آج ان کے ساتھی آہ و زاری کر رہے ہیں ان کے پیرو سینہ کوبی کر رہے ہیں نوجوان آنسو بہا رہے ہیں قائد ملت کی خاموشی ان سب سے ایک سوال کر رہی ہے. قائد ملت اپنے پیرو اور اپنے رفیقوں اور نوجوانوں سے مخاطب ہو کر دریافت کر رہے ہیں اب مجھے اپنا ساتھی اپنا رفیق کار اور اپنا قائد کہہ کر پکارنے والو کیا تم اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتے ہو کہ تم مجھے اپنا ساتھی اپنا قائد کہہ سکیں. کیا تم نے کبھی خدا کی راہ میں اپنے آپ کو لٹا دینے کا عملی عہد کر لیا ہے. کیا تم نے کبھی خدا کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنے اور اس کے حکم و ایماء کے ماتحت اپنی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیا ہے. کیا تم نے کبھی خدا کی راہ میں قوم کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے دریغ نہیں کیا؟ تمھیں کبھی تمھارے حق و صداقت کی وجہ سے مجرم ٹھہرایا گیا

کیا تمھاری خالص مذہبیت اور صحیح اسلامی جذبہ کی وجہ سے تمھیں بھی کفر کے فتووں کی دھمکیاں دی گئیں۔ کیا تمھارے کبھی قومی خدمات کے راستوں میں روڑے اٹکائے گئے، کیا تمھیں بھی نیک کاموں سے ہٹانے کے لیے امرانات اور روپیہ پیسہ کا لالچ دی گئی؟ اور کیا تم ان تمام مصیبتوں اور رکاوٹوں کے باوجود بلند ہمتی سے آگے بڑھنا چاہتے ہو؟ اور کیا تم ان تمام مشکلوں کا مستقل مزاجی اور مردانگی سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو ___ اگر نہیں تو میری دوستی میری قیادت اور میری رفاقت کا دم مت بھرو۔ تم اس حالت میں اپنا دوست اپنا رفیق اور اپنا قائد کہہ کر مجھے شرمندہ مت ہونے دو۔ اور اگر تم ان تمام چیزوں کے لیے تیار ہو، اور تم اس مقام پر پہنچنا چاہتے ہو جہاں میں تمھیں دیکھنا چاہتا تھا تو بے شک تم میری دوستی کا دم بھر سکتے ہو اور میں بھی تم پر ناز و فخر کرنے لگوں گا۔

قائد ملت سے عقیدت رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے قائد کی زندگی کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں قائد ملت ایک زبردست انقلابی تھے اور انقلاب آپ سے عقیدت نہیں بلکہ ایثار قربانی اور عمل چاہتا ہے۔ قائد مرحوم کی زندگی اور ان کی تعلیمات کو عملی طریقہ سے سمجھنا اور اس پر سختی سے عمل کرنا ملت کی ایک اہم ضرورت ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر ہماری کامیابی اور ہمارے شاندار مستقبل کا دارومدار ہے۔

اخبار تنظیم کا اداریہ

ملتِ اسلامیہ دکن کا آفتاب غروب ہو گیا

دوشنبہ ۳ رجب کی صبح کتنی غم انگیز اور اداس تھی جب قائد اسلامیان

دکن بہادر خاں کے سانحہ ارتحال کی خبر سارے ہندوستان کے طول و عرض میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور رود اس قائد جلیل کی جوانمرگی پر آنسو بہانے لگے جو ایک بلند و بالا تر شخصیت کا مالک تھا اور جس سے اسلامیانِ ہند بڑی بڑی توقعات رکھتے تھے آہ ہم سب کے لیے یہ صدمہ کتنا زبردست ہے کہ عندلیب بوستاں دیکھتے دیکھتے خاموش ہو گیا وہ جس کے سحر کار نغمے سارے ہندوستان سے خراج تحسین وصول کرتے تھے اور جس کی حجازی لے زندگی کی ایک عجیب تڑپ پیدا کرتی تھی آج ہر لب پہ ہے۔ سب کی زبانوں پر یہی ہے کہ اب بہادر خاں کا بدل کوئی نہیں ایسا پر خلوص سپاہی اور قائد اب کہاں اس نے ملک و ملت کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس راہ میں سب کچھ قربان کر کے مسکراتا ہی رہا۔ اہل ملک کے اختلافات پر جس کا دل ملول رہا آج اس کی جدائی پر سب رنج و ملال میں گرفتار ہیں اس نے ملت کی زبوں حالی پر ہمیشہ آنسو بہائے اور اس کی رحلت پر لاکھوں آنسو بہا رہے ہیں۔ سب کی زبانوں پر یہی ہے کہ یہ قومی نقصان ناقابل تلافی ہے کتنا شدید اور کتنا عظیم!! سب کہہ رہے ہیں کہ یہ وفات صرف بہادر خاں کی نہیں رسول اللہ کے سچے عاشق کی بھی ہے وہ جس کا دل نام پاک کے سنتے ہی دھڑکنے لگتا تھا اور جس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے آج کتنے بلند مقام پر پہنچ گیا ہے یا وہ جو ملت کا فدائی اور بنی نوع انسان کا غم گسار تھا آج کس قدر محبوب و محترم ہو چکا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نواب سر نظامت جنگ بہادر کا پیام تعزیت

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. قدرت نے اس ملک میں ایک غیر معمولی ہستی پیدا کی تھی اور یہ بہت جلد اس کو ہماری نظر سے غائب کر دیا۔ اس کی عظمت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ مرحوم محمد بہادر خاں پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا فضل رہا ان کے دل میں صداقت ان کے ارادوں میں عظمت اور ان کے کاموں میں قوت اس کی دلیل تھی اور انشاء اللہ ان کا کیا ہوا کام باقی رہے گا، اور خود اپنی آپ تکمیل کرتا جائے گا۔ اس کی نوعیت دائمی ہے اور اصلاح نفس سے اصلاح قوم کا سبق اوپر سے چلا آرہا ہے۔ عالم صالح ہونے کے علاوہ مرحوم بہت بڑے مقرر بھی تھے لیکن ان کی تقریر صرف آواز نہیں بلکہ دل کی حرکت تھی جس کا ایک خاص اثر دوسرے دلوں پر ہوتا تھا اور اگرچہ وہ سیاسیات سے بھی بحث کر جاتے تھے لیکن دراصل ان کے سیاسی خیالات بھی اخلاقی جذبات سے متاثر تھے۔ اور یہ معلوم ہے کہ شور و غل اور فسادی طریقوں سے ان کو دلی نفرت تھی اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مالک اور ملک کے سچے خیر خواہ تھے۔

ان اوصاف کے لحاظ سے میں ان کی عزت کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کی خاص جگہ تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے دادا صاحب مرحوم کو میں نے دیکھا تھا ان کے والد مرحوم سے ملاقات تھی اور خود ان کو بہت چھوٹی عمر سے دیکھتا تھا اس ملک میں وہ ایک نمونہ تھا اوائل عمر سے علم حاصل کرنے کا شوق اور اپنی قابلیت کو بہترین طریقہ سے کام میں لانے کا خیال اور اس کی تیاری اور اپنے آپ کو

ایک بڑے کام کے لیے وقف کر دینا یہ سب ان کی طبیعت کے خصوصیات میں داخل تھا۔ لہذا ان کے وجود کو میں اپنے ملک کی خوش قسمتی سمجھتا تھا جیسا کہ ان کے جانے کے بعد قوم کی بدقسمتی سمجھتا ہوں تاہم صبر و شکر ہمارا کام ہے اور یہ باور کرنا چاہیے کہ جو قوت ہماری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئی وہ پس پردہ اپنا کام کرتی رہے گی انشاء اللہ تعالیٰ! قوم پر واجب ہے کہ جو اصلاحی کام دار السلام کا ہے اس کو صبر اور تدبیر اور استقلال اور قوت کے ساتھ چلاتے رہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی امید رکھیں۔

پنڈت راما چاری کا پیام

نواب بہادر یار جنگ کے اچانک اور بے وقت انتقال سے ملک اور مالک کا جو نقصان ہوا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی ہستیاں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ دنیا کی بڑی شخصیتوں میں ان کا شمار تھا۔

قطب شاہی چار مینار کی آغوش میں

ایرانی فنِ تعمیر

کا

عظیم شاہکار

فراشا کیفے اینڈ بیکری

شہر حیدرآباد کا مایہ ناز اور خوبصورت کیفے

فراشا کیفے اینڈ بیکری

چار مینار۔ حیدرآباد

تصوّر سے زیادہ خوبصورت

فوٹو کاپی کے لیئے

تشریف لائیے

سوپر سانک کاپینگ سنٹر

دیوان دیوڑھی، حیدرآباد

جتنے چہرے مختلف، اتنی پسند مختلف

ہمارا تیار کردہ ہر پسند کا دل پسند زردہ

آپ کو انتخاب کی دعوت دیتا ہے

• جمناز عفرانی قوام • جمناز عفرانی پتی 555

• جمناز عفرانی پتی نمبر 20 • جمناز عفرانی پتی نمبر 303

• جمناز عفرانی پتی نمبر 400 • جمناز عفرانی پتی نمبر 20

• بانور زردہ • راکٹ زردہ • راکٹ زردہ نمبر 40

ذائقہ دار زردہ کھائیے، پان کا لطف اٹھائیے

تیار کردہ:

حیدرآباد زردہ ورکس

روبرو پتھر گٹی مسجد، پتھر گٹی ۵۰۰۰۰۲ حیدرآباد۔ اے پی۔ انڈیا